قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹ شمارہ: ۴
ربیع الثانی: ۱۴۳۷ھ - فروری: ۲۰۱۶ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر/ مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی نمبر: 5، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 101900-397-7 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر وعبر

استحکامِ مدارس دینیہ کانفرنس !	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

تقلید مجتہدین خیر القرون میں !	۹	حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
جاوید احمد غامدی، سیاق وسباق کے آئینہ میں (قسط:۱۵)	۱۶	مولانا فضل محمد یوسف زئی
اسلام.....کے خلاف محاذوں کی تکثیر اور اُسوۂ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم	۲۵	مولانا نور عالم خلیل اَمینی (انڈیا)
حلال وحرام سے متعلق ریاست کی ذمہ داری (قسط:۲)	۳۷	مفتی شعیب عالم
مدارس کا نظامِ تربیت	۴۴	مولانا میر زاہد مکھیالوی (انڈیا)

یادِ رفتگان

علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت	۴۷	محمد اعجاز مصطفیٰ
یادگارِ اسلاف حضرت مولانا محمد عبداللہؒ (بھکر) کی رحلت	۵۱	

دار الافتاء

محض تصاویر دیکھ کر مشین کا حتمی کاروبار کرنا !	۵۷	ادارہ

نقد ونظر

	۵۹	ادارہ

www.banuri.edu.pk

استحکامِ مدارس دینیہ کانفرنس!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

اہل سنت والجماعت علمائے دیوبند کی عظیم الشان مشہور ومعروف علمی، دینی، تبلیغی وروحانی درسگاہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ’’استحکام مدارس دینیہ‘‘ کے عنوان سے ایک باوقار ونمائندہ اجتماع ۱۵؍ربیع الاول ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۷؍دسمبر ۲۰۱۵ء بروز اتوار کو جامعہ کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں کراچی ڈویژن کے تمام مدارس کے مہتممین اور ذمہ دار حضرات شریک ہوئے، خصوصاً وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، دارالعلوم کراچی کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب، حضرت مولانا اسفندیار خان صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب، حضرت مولانا حکیم محمد مظہر صاحب، حضرت مولانا محمد زرولی خان صاحب جیسے اکابر ومشائخ اسٹیج کی زینت بنے۔

اس باوقار اور نمائندہ اجتماع کو کامیاب بنانے اور اس کی بھرپور تیاری میں جن حضرات نے رات دن ایک کیا، ان میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات واستاذ الحدیث، وفاق المدارس سندھ کے ناظم حضرت مولانا امداد اللہ صاحب، معاون ناظم حضرت جناب مولانا عبدالرشید صاحب، کراچی کے کوآرڈینیٹر برادر عزیز مولانا ابراہیم سکرگاہی وغیرہم کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے فیصلے کے مطابق ملک بھر میں دینی مدارس کے مہتممین کے اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ ہوا، چنانچہ پہلے مرحلے میں صوبہ پنجاب میں چار اجتماعات ہوئے، اس کے بعد خیبرپختونخواہ میں چار اجتماعات ہوئے، صوبہ سندھ میں یہ پہلا اور مجموعی طور پر ''استحکام مدارس دینیہ'' مہم کا یہ نواں اجتماع تھا اور اس کے بعد ان شاء اللہ! حیدرآباد اور سکھر میں بھی اسی نوعیت کے اجتماعات ہوں گے، اور آخری مرکزی اجتماع ۲۳ر مارچ ۲۰۱۶ء کو مینار پاکستان کے سائے میں ان شاء اللہ! منعقد ہوگا۔

شرکائے اجلاس کی آمد کا آغاز صبح ہی سے شروع ہوگیا تھا، جامعہ میں داخل ہوتے ہی آنے والے مہمانانِ گرامی کی چائے سے تواضع کی جاتی رہی، جامعہ کی مسجد میں معزز مہمانوں کے لیے محراب کے دونوں جانب کرسیاں لگا کر خوبصورت اور عمدہ نشستیں لگائی گئیں۔

اجلاس بروقت حسب روایت قرآن کریم کی تلاوت اور نعت سے شروع کیا گیا، سب سے پہلا بیان مسجد بیت السلام کے امام وخطیب حضرت مولانا عبدالستار صاحب حفظہ اللہ کا ہوا، جس میں انہوں نے اہل مدارس پر تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کرام کی اخلاقی تربیت، مدرسہ کی صفائی کے نظم اور خصوصاً مدرسہ کے اندر کے نظم کو صاف وشفاف رکھنے پر زور دیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا اسفندیار خان صاحب کا بیان ہوا، جس میں انہوں نے وفاق کی قیادت کو مدارس کا مقدمہ حکومتی ایوانوں میں پیش کرنے اور اہل حکومت سے اپنے موقف کو منوانے پر مبارک باد پیش کی اور اہل مدارس کی طرف سے وفاق کی قیادت پر بھرپور اعتماد اور تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے بعد شیخ طریقت حضرت مولانا حکیم محمد مظہر صاحب نے اپنے خوبصورت اشعار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد اور صفائے باطن پر خوبصورت نصائح ارشاد فرمائیں۔ اس کے بعد تفصیلی بیان وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری زیدمجدہم کا ہوا، جس میں انہوں نے ''استحکام مدارس دینیہ کنونشنز'' کے اغراض ومقاصد، اب تک حکومت سے ہونے والے مذاکرات کے بارہ میں تفصیلات سے آگاہ اور وفاق کی جانب سے اہل مدارس کو بھیجے جانے والے کوائف نامہ کی اہمیت وضرورت کو واضح فرمایا۔ حضرت ناظم اعلیٰ وفاق المدارس کے بیان کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ حضرت نے ان اجتماعات کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اہل مدارس حضرات سے رابطہ کرنا، آپ حضرات سے ملاقات کرنا، آپ حضرات کی تجاویز وآراء کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کرنا، اس لیے کہ ایک دور ایسا تھا کہ جب وفاق المدارس کے ساتھ ملحق مدارس کی تعداد عشروں میں تھی، پھر وہ سینکڑوں میں تھی اور رفتہ رفتہ اس سے زیادہ ہوئی، جس زمانے میں مدارس کی تعداد کم تھی تو وفاق کی قیادت سال دوسال کے بعد مدارس کا دورہ کرتی، معائنہ کرتی۔ ۱۴۰۱ھ، ۱۹۸۱ء میں قائد وفاق کی معیت میں ہم نے گاؤں اور چھوٹے شہروں میں مدارس کے دورے کیے، لیکن آج الحمدللہ! آپ کے بانیوں کے اخلاص اور آپ کے اکابرین کی محنت اور اخلاص کے

نتیجے میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ساتھ ملحقہ مدارس کی تعداد اٹھارہ ہزار سے زائد ہے، اتنی بڑی تعداد میں ہر مدرسہ میں جانا سالوں میں ممکن نہیں ہے، اس لیے یہ طے کیا گیا کہ ڈویژنوں کی سطح پر، اضلاع کی سطح پر اجتماعات کیے جائیں، تاکہ آپس کے رابطہ کو بڑھایا جائے اور اس رابطے کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لیے یہ اجتماع ہوا۔

۲:....حالیہ دنوں میں بالخصوص ۱۶؍دسمبر ۲۰۱۴ء کے سانحہ پشاور کے بعد جو دینی مدارس کو ہدف بنادیا گیا، دینی مدارس کے خلاف پہلے سے تیار منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لیے کارروائیاں شروع کردی گئیں، تو اس عرصہ میں صوبائی حکومتوں سے مرکزی حکومتوں سے جو مذاکرات ہوئے، ان مذاکرات کی کچھ روئیداد، کچھ تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی جائے، تاکہ آپ کو وفاق کا موقف معلوم ہو، وفاق المدارس کی جدوجہد معلوم ہو۔

۳:....ان اجتماعات کے لیے وفاق المدارس کی مجلس عاملہ اور شوریٰ نے جو فیصلے کیے ہیں یا جو حالیہ دنوں میں کچھ امور طے کیے ہیں، ان کے بارے میں آپ کو آگاہ کرکے اعتماد میں لیا جائے، یہ تین بنیادی مقاصد ہیں۔

جہاں تک حکومت سے ہونے والے مذاکرات کی روئیداد کا تعلق ہے، میں اس کا اجمال یا تفصیل عرض کرنے سے پہلے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک عرصہ دراز سے دینی مدارس ہدف ہیں، دینی مدارس کے خلاف بیانات واحکامات بین الاقوامی ایجنڈے کا حصہ ہیں۔ آج عالمی قوتوں کے ایجنڈے پر جس طرح اسلام ہے، مسلمان ہیں، مسلم ممالک ہیں، مسلم ممالک کے وسائل ہیں، اسی طرح آج عالمی قوتوں کے ایجنڈے پر دینی مدارس بھی ہیں، اسلامی اور دینی قوتیں بھی ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس کا جواب آپ کے پاس موجود ہوگا۔ لیکن میں آپ کو وفاق المدارس کے پہلے صدر جو وفاق کے بانیوں میں بھی شامل ہیں، ان کی ایک بات سنانا چاہتا ہوں، جو وفاق المدارس کے پہلے صدر شمس العلماء حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۶۰ء میں خیرالمدارس ملتان میں وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی، اور اس بات کو جب میں نے پڑھا تو مجھے حیرانگی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اکابر کو کیا فراست، کیا بصیرت، کیا دور رس نگاہ عطا فرمائی تھی، انہوں نے آج سے ۵۵ سال پہلے وہ بات فرمائی جو آج کے حالات پر سو فیصد صادق آتی ہے، انہوں نے کتنا عرصہ پہلے اس صورت حال کو بھانپ لیا، انہوں نے وفاق کی مجلس شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

آج دنیا میں مقابلہ اسلام اور عیسائیت کا نہیں ہے، اسلام اور یہودیت کا نہیں ہے، اسلام اور ہندوازم کا نہیں ہے، کسی مذہب کے ساتھ آج اسلام کا مقابلہ اور آج یہ تقابل نہیں ہے، فرمایا کہ: اسلام اور عیسائیت کے مقابلے ہوئے، اسلام اور یہودیت کے ہوئے، مگر اب عیسائیت ایک قوم بن چکی ہے، یہودی ایک قوم کی شکل اختیار کر بیٹھی، ہندو اور سکھ ایک قوم ہیں، آج مقابلہ دنیا میں اسلام

اورمغربیت کا ہے، آج مغرب ایک مذہب، ایک فکر، ایک فلسفہ، ایک نظریہ اورایک تہذیب کی شکل اختیار کر چکا ہے، اس لیے آپ دنیا کے حالات پر نظر ڈالیں تو خواہ وہ عیسائی ملک ہو، خواہ وہ یہودی ملک ہو، خواہ اس ملک کی اکثریت آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہو، خواہ بدھ مت مذہب کے ماننے والے اکثریت میں ہوں، آج مغرب یہ چاہتا ہے کہ میری فکر، میرا فلسفہ، میرا نظریہ، میرا کلچر، میری تہذیب، میرا تمدن وہاں پر نافذ ہو۔ وہ عیسائیوں پر اپنی فکر کو مسلط کرنا چاہتا ہے، وہ یہودی ملکوں میں بھی اپنے نظریئے کو مسلط کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی تہذیب کو دنیا کے تمام ممالک پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج عیسائی ملکوں میں بھی ہم جنس پرستی کے قانون بن رہے ہیں، آج عیسائی ملکوں کے اندر بھی انسانی حقوق کو اللہ کے قوانین پر برتری دی جاری ہے۔آج عیسائی ملکوں میں بھی وہ کلچراورتہذیب جواُن کے مذہب میں نہیں ہے، آج وہاں پر بھی مغرب کی فکراور فلسفہ موجود ہے۔

آپ اہل علم ہیں، آپ اس کی تفصیل کو جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج یورپ اور مغرب کے ملکوں میں دیکھ لیں کہ وہاں پر ان کے مذہب میں کلچر نہیں ہے، جو آج ان کے ملک میں قانونی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، یہ آپ کو نہیں ملیں گے، کیونکہ آج کا مغرب اپنی فکر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ مغرب کی اس فکر کے مقابلے میں دنیا کے تمام مذاہب ہمارے ساتھ کھڑے ہوتے ، مگر انہوں نے پسپائی اختیار کی اوراس مذہب کی فکر کے مقابلے میں اگر کوئی سینہ تان کر کھڑا ہے تو وہ اسلام ہے اور مسلمان ہے، جو اس کو چیلنج کر رہا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کا مرکز چونکہ دین کا مدرسہ ہوتا ہے، اس کو اپنا مذہب، اپنا نظریۂ فکر اور اپنے عقائد ونظریات اوراس کو اپنی تہذیب وتمدن چونکہ مدرسہ سے ملتی ہے، مدرسہ اس کا مرکز ہوتا ہے، اس لیے آج بین الاقوامی ایجنڈے پر مدرسہ ہے، چونکہ مدرسہ مغرب کی فکراور فلسفے، مغرب کے نظریات اور مغرب کی تعلیم وتمدن میں سد سکندری بن کر کھڑا ہے، آج کا مولوی اسے چیلنج کر رہا ہے، اس لیے آج بین الاقوامی قوتوں کا سب سے پہلا ہدف دین کا مدرسہ ہے۔ میرے دوستو! ہمیں اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے، کہ ہمارے مدارس کے خلاف یہ آئے دن کے اقدامات یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: ''حکومت کی پالیسیاں مؤخر ہوتی ہیں، ملتوی ہوتی ہیں، منسوخ نہیں ہوا کرتیں۔'' وہ اپنے منصوبے مناسب وقت کے انتظار میں رکھتے ہیں کہ کب کوئی وقت ملے گا تو ہم اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ ہدف اسلام اور اسلام کی تعلیم کے مراکز ہیں اور چونکہ وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، پشاور کا سانحہ ہوا، تو کئی لوگوں نے سمجھا اب مدارس کو کنٹرول کرنے کا بہترین وقت ہے، قومی ایکشن پلان آ گیا، نیشنل ایکشن پلان آ گیا اور اس نیشنل ایکشن پلان کے اندر بیس نکات میں سے ایک نکتہ جان بوجھ کر مدارس کا شامل کیا گیا۔

جس وقت وزیر اعظم پاکستان نے قومی ایکشن پلان کا اعلان کیا، ہم اس وقت اسلام آباد میں

تھے، ہمارے اسلام آباد کے دوستوں سے اس سے ایک دن پہلے ہی ہمارا یہ مشورہ ہوا تھا کہ ہم تمام راولپنڈی اور اسلام آباد کے علماء کا اجتماع بلا رہے ہیں، کیونکہ سانحہ پشاور کے بعد اعلانات شروع ہوگئے تھے، تو انہوں نے وہاں اجتماع کیا، تقریباً پانچ سو کے قریب علماء تھے۔ اس میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ بھی تشریف لائے، اور یہ فقیر بھی وہاں حاضر تھا، میں نے کہا کہ: وزیر اعظم صاحب نے رات قوم سے خطاب میں جو قومی ایکشن پلان میں دینی مدارس کا ذکر کیا ہے اور جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، ہم اس کو مسترد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وزیر اعظم نے مدرسہ کے حوالہ سے نیشنل ایکشن پلان میں جن تین باتوں کا تذکرہ کیا، وہ تینوں باتیں خلاف واقعہ ہیں، ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ اور وزیر اعظم کو نوٹس لینا چاہیے کہ کس نے کون سی بنیاد پر قوم کو اندھیرے میں رکھا؟ اٹھارہ کروڑ عوام کے ملک کا وزیر اعظم اگر ایسی بات کرے کہ جس کا سرے سے ہم سے کوئی تعلق نہ ہو تو یہ قابل افسوس بات ہے۔

وزیر اعظم صاحب نے دینی مدارس کے حوالہ سے تین باتیں کہی ہیں:

پہلی بات یہ کہ..... ''ہم دینی مدارس کو رجسٹرڈ کریں گے'' ہم نے کہا کہ: دینی مدارس تو پہلے سے رجسٹرڈ ہیں اور دینی مدارس کی رجسٹریشن کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں ہے۔ دینی مدارس کی رجسٹریشن ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء سے ہورہی ہے، اور اب بھی حکومت کے مختلف محکموں کے دفتروں میں ہمارے مدارس کی رجسٹریشن کی درخواستیں زیرالتوا پڑی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وزیر اعظم یہ اقدام کرتے اور حکم نامہ جاری کرتے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر تمام ملتوی درخواستوں کا کام نمٹا کر مدارس کو رجسٹرڈ کیا جائے اور جو اہلکار رکاوٹ ڈال رہے ہیں، ہم ان کے خلاف کارروائی کریں گے، ان کو کہنا یہ چاہیے تھا، مگر انہوں نے کہا کہ ہم مدارس کو رجسٹرڈ کریں گے تو یہ خلاف واقعہ بات وزیر اعظم نے کہی اور ان کو غلط بتائی گئی۔

دوسری بات:..... انہوں نے یہ کہی کہ: ''دینی مدارس کو ملک کے قانون کا پابند بنائیں گے'' میں نے کہا یہ بھی خلاف واقعہ بات کہی۔ اہل مدارس تمام قوانین کی خود ارباب اقتدار سے زیادہ پابندی کرتے ہیں، ہم پر کبھی قانون شکنی کا الزام نہیں آیا۔ ہم نے ہمیشہ قانون اور آئین کا احترام کیا ہے۔ قانون اور آئین کو حکومتوں اور اداروں نے توڑا ہے۔ ہم نے آج تک قانون کو نہیں توڑا، ہم قانون نہ توڑتے ہیں نہ قانون کو توڑنے دیں گے، نہ مدارس کا دفاع چھوڑیں گے، نہ قانون توڑیں گے۔ ہمارے مدارس خود بے انتہاء قوانین کے پابند ہیں۔ یہ کہنا کہ مدارس کو ملکی قوانین کا پابند بنایا جائے گا، یہ بھی خلاف واقعہ بات ہے۔

تیسری بات:...... وزیر اعظم کے اس خطاب میں قومی ایکشن پلان کے اندر یہ آئی کہ: ''دینی مدارس کی فنڈنگ اور ان کی آمدنی کے ذرائع کو چیک کیا جائے گا کہ ان کو پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ کون ان کو پیسے دیتا ہے؟'' تو میں نے کہا کہ دینی مدارس ایک ایک پائی کا حساب رکھتے ہیں، ہمارے اوپر آج تک کوئی کرپشن کا الزام نہیں ہے، سر سے پاؤں تک کرپشن میں ڈوبے ہوئے حکومتی لوگ ہیں۔ دینی مدارس نے تو اللہ کو جواب دینا ہے۔ اگر کوئی ایک روپیہ بھی مدرسہ کو دیتا ہے تو اہل مدارس اس کا بھی

حساب رکھتے ہیں، کوئی پچاس لاکھ دیتا ہے اور رسید نہیں مانگتا تو مدرسہ کا منتظم اس کا بھی حساب رکھتا ہے۔ ہم ان پیسوں کے حسابات کا آڈٹ کرواتے ہیں اور آڈٹ کاپی متعلقہ رجسٹریشن آفس میں جمع کراتے ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ دینی مدارس کی آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟ یہ بھی خلاف واقعہ بات ہے اور اس میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ ہمارا موقف تھا اور اب بھی ہے۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب نے وزیر اعظم اور آرمی چیف کی موجودگی میں حکومتی نمائندوں سے ہونے والے مذاکرات کے بارہ میں اہل اجتماع کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ: مدارس کے متعلق ہدایات اور حکومت سے ہونے والے مذاکرات کی آگاہی کے لیے وفاق المدارس رسالہ کو اہمیت کے ساتھ پڑھا کریں۔ ان کے بعد وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر مذہبی امور جناب عبدالقیوم سومرو صاحب نے خطاب کیا اور مدارس کو درپیش مسائل اور اس کے اسباب و وجوہ کے بارہ میں نشان دہی کی اور اس کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم کا بیان ہوا، جس میں آپ نے اہل مدارس سے فرمایا کہ: مدارس کے حسابات اور آمدوخرچ کو صاف شفاف رکھیں، اگر کوئی مدرسہ میں سوئی بھی دیتا ہے تو اس کی رسید کاٹیں اور وہ سوئی کہاں استعمال ہوئی، اپنے رجسٹروں میں اس کا بھی اندراج کریں۔ اس پر آپ نے محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہٗ کا ایک واقعہ سنایا کہ آپ مدرسہ کی اشیاء کے بارہ میں کتنا محتاط تھے، فرمایا کہ: حضرت بنوری قدس سرہ تشریف فرما تھے، ایک صاحب جو جامعہ میں بھی خدمات سرانجام دیا کرتے تھے اور دوسری جگہ پر بھی، انہوں نے حضرت کے سامنے سے ایک کاغذ اٹھا کر کچھ لکھنا چاہا، آپ نے فرمایا: جناب! یہ کاغذ مدرسہ کی دینی ضروریات کے لیے ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ حضرت! میں بھی ایک دینی خدمت کے لیے یہ کاغذ استعمال کررہا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا: ''جس نے یہ کاغذ دیا ہے، اس نے اس مدرسہ کے دینی کام کے لیے دیا ہے، دوسری جگہ کے دینی کام کے لیے نہیں۔'' یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے فرمایا: یہ ہمارے اکابر کا طرزِ عمل ہے، جس کی ہمیں پیروی کرنا چاہیے۔ آخری خطاب جامعہ دارالعلوم کراچی کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا ہوا اور جامعہ کے رئیس حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کی دعا پر یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا، یہ اجتماع ظہر کی نماز تک جاری رہا، نماز کے بعد تمام مہمانوں کے اعزاز میں پرتکلف کھانے کا انتظام کیا گیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس اجتماع کو کامیاب بنانے والوں اور اس میں دامے، درمے، سخنے خدمت بجالانے والوں کو اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے۔ مدارس اور اہل مدارس کی حفاظت فرمائے اور مدارس کی خیر و برکات سے جملہ عالم اسلام کو مستفید و منور فرمائے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

تقلید مجتہدین خیر القرون میں!

حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

عقل وشرع دونوں کا فتویٰ ہے اور سب کو معلوم بھی ہے کہ نادان اور دانا، عالم اور جاہل، خاصی اور عامی کسی امر کی حقیقت معلوم کرنے میں برابر نہیں، خواہ اس امر کا تعلق علوم دنیوی سے ہو یا علوم دینی سے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ، إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوْا الْأَلْبَابِ''۔ (الزمر:۹)

''آپ فرما دیجئے! کہیں برابر ہوتے ہیں علم والے اور بے علم، سوچتے وہی ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔''

فارسی کی مشہور مثل ہے: ''علم شے بہ از جہل شئے'' اسی لیے بے علم کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں اہل علم سے رجوع کیا کرے، شریعت میں تو اس کی اور زیادہ تاکید ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے: ''فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ''۔ (النحل:۴۳) ..... ''سو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اگر تم علم نہیں رکھتے۔'' اور حدیث نبوی میں وارد ہے: ''شفاء العی السوال'' (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ، وابن خزیمہ وابن الجارود والحاکم والدارقطنی والضیاء فی ''المختارۃ'') .... ''درماندہ کا علاج ہی دریافت کرلینا ہے۔''

معلوم ہوا کہ غیر اہل علم کو جب بھی ضرورت پیش آئے ''اہل علم'' سے مسئلہ دریافت کرکے اس پر عمل کرے۔ لیکن شریعت کا مسئلہ بتانا ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لیے دینی تفقہ کی ضرورت ہے، جو شخص فقیہ نہ ہو اس کا فتویٰ قابل قبول نہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَانَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ''۔ (التوبہ:۱۲۲)

''اور ایسا تو نہیں کہ سارے ہی مسلمان نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ نکلا ہر جماعت میں سے ان کا ایک حصہ، تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی جانب لوٹ کر آئیں تو ان

کو ڈرائیں، تاکہ وہ (خدا کی نافرمانی سے) بچتے رہیں''۔

اس آیت شریفہ سے واضح ہوا کہ ''اِنذار'' خدا کے حکموں سے ڈرانا اور اس کے احکام کی تبلیغ کرنا اور مسائل شرعیہ کا بتانا ان لوگوں کا حق ہے جن کو ''تفقہ فی الدین'' یعنی دینی مسائل کی سمجھ حاصل ہو اور خدا کے حلال وحرام اور اس کی مرضی نامرضی کو جانتے ہوں اور دوسرے لوگوں کا کام ان کے بتلائے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرنا ہے اور حدیث شریف (مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ:۳۶) میں وارد ہے:

''نعم الرجلُ الفقيهُ فی الدين إن احتيج إليه نفع، وإن استغنى عنه أغنٰى نَفْسَهٗ''۔

''بڑا اچھا ہے وہ شخص جو دین میں فقیہ ہو کہ اس کی طرف حاجت پڑے تو وہ نفع پہنچائے اور اگر اس سے بے نیازی کی جائے تو وہ اپنے آپ کو بے نیاز رکھے۔''

مطلب یہ کہ فقیہ کی شان یہ ہے کہ لوگ اس سے مسئلے پوچھیں تو ان کو نفع ہو اور اگر اس سے استغناء برتیں تو وہ دوسرے کا محتاج نہیں کہ اس کو کسی سے مسئلہ دریافت کرنے کی حاجت ہو۔

علمی اصطلاح میں جو شخص فتویٰ دینے کا اہل ہو اور ادلۂ شرعیہ سے احکام شرعیہ کو نکال سکے وہ فقیہ اور مجتہد کہلاتا ہے اور جس میں یہ اہلیت نہ ہو وہ عامی ہے۔ اس کو چاہیے کہ مجتہد کے قول پر عمل کرے اور اس کی تقلید کرے۔ یہ مسئلہ امت مرحومہ کا اجماعی مسئلہ ہے اور اس میں اہل حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے، چنانچہ علامہ محدث ابوالحسن صغیر سندھی مدنی ''بہجۃ النظر شرح نخبۃ الفکر'' میں فرماتے ہیں:

''وقد أجمع الأمة على أن العامی مامور باتباع المفتی مع أنه ربما يخبر عن رأيه۔'' (بہجۃ النظر شرح نخبۃ الفکر، ص:۱۹، طبع: مطبع محمدی لاہور، ۱۳۰۹ھ)

''امت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ عامی کو یہ حکم ہے کہ وہ مفتی کا اتباع کرے، حالانکہ بعض وقت مفتی فتویٰ میں صرف اپنی رائے دہی کا اظہار کرتا ہے۔''

عہدِ رسالت سے لے کر آج تک امت کا عمل اسی طریق پر ہے، عہد نبوی میں مدینہ منورہ میں تو خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور علیہ الصلاۃ والسلام سے آ کر مسائل معلوم کیا کرتے تھے، لیکن مدینہ منورہ کے علاوہ جو شہر اور بستیاں تھیں، وہاں کے رہنے والے ان حضرات کے فتووں اور فیصلوں پر عمل کرتے تھے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں قاضی اور معلم بنا کر بھیجا تھا۔ حضرت میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ ''معیار الحق'' میں مولانا حیدر علی صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے ناقل ہیں:

''بر اہل علم مخفی نیست کہ از صحابہ کرامؓ چند صحابہؓ معدود مجتہد بودند وباقی ہمہ مقلد۔''

''اہل علم پر یہ مخفی نہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے چند گنے چنے صحابیؓ مجتہد تھے اور باقی سب مقلد۔'' (معیار الحق، ص:۸۳، طبع: مطبع رحمانی دہلی، ۱۳۳۷ھ)

یہ عبارت مولانا حیدر علی صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوے کی ہے جس کو میاں صاحب موصوف نے اس تمہید کے ساتھ اپنی کتاب ''معیار الحق'' میں نقل کر کے مسلم رکھا ہے کہ:

''مولانا مغفور نے ۱۲۷۰ھ میں ایک فتویٰ جواب میں کسی سائل کے تحریر فرمایا تھا اور ۱۲۷۱ھ میں مع مواہیر علمائے ٹونک اور دہلی بقالب طبع آیا تھا، وہ بھی نقل کیا جاتا ہے۔'' (ص:۸۱)

یہ بھی واضح رہے کہ مولانا حیدر علی صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت علمی کا اعتراف میاں صاحب مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولوی سید حیدر علی مرحوم ساکن قصبہ ٹونک کہ جو بڑے عالم متبحر، جامع معقول اور منقول، شاگرد رشید مولانا شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین قدس سرہما کے تھے''۔ (ص:۷۹)

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''قرة العينين في تفضيل الشيخين رضی اللہ عنہما'' میں رقم طراز ہیں:

صحابہؓ وتابعینؒ ہمہ در یک مرتبہ نبودند، بلکہ بعض ایشاں مجتهد بودند وبعض مقلد، قال اللّٰہ تعالیٰ: ''لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ۔'' (ص:۲۵۱، طبع: مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۱۰ھ)

''صحابہؓ وتابعینؒ سب ایک مرتبہ کے نہ تھے، بلکہ بعضے ان میں سے مجتہد تھے اور بعضے مقلد، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ضرور معلوم کر لیتے اس امر کو وہ لوگ کہ جو اس امر کی ان میں سے تحقیق کرنے والے ہیں (معلوم ہوا دوسرے لوگ محقق نہیں، مقلد تھے)۔''

غرض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے دور میں عام لوگ اپنے اپنے شہر کے فقہاء اور اہل فتویٰ کی تقلید کیا کرتے تھے اور ان ہی کے بتائے ہوئے مسئلوں پر عمل کرتے تھے۔ بعد کو جب تبع تابعینؒ کے دور میں علوم اسلامی کی تدوین شروع ہوئی اور اس سلسلے میں علم فقہ کی تدوین بھی کتابی شکل میں عمل میں آئی تو اس دور کی حکومتوں نے اس کو اپنا دستور العمل بنایا اور عوام وخواص نے اسی فقہ مدوّن پر عمل شروع کردیا۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''إن الناس لم يزالوا من زمن الصحابة رضی اللہ عنہم إلى أن ظهرت المذاهب الأربعة يقلدون من اتفق من العلماء من غير نكير من أحد۔''

(ملاحظہ ہو، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، از شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ، ص:۲۹، طبع: مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۴۴ھ)

''بے شک لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد سے لے کر چاروں مذہبوں کے شائع ہونے تک ان علماء کی تقلید کرتے رہے جو اُن کو ملتے، اس امر پر کسی نے نکیر نہیں کی۔''

مجتہدین اگرچہ بہت ہوئے ہیں، لیکن حق تعالیٰ نے جو قبول عام ان ائمہ اربعہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب فرمایا، وہ دوسرے ائمہ کو نصیب نہ ہوا۔ شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''صراط مستقیم'' میں فرماتے ہیں:

''امامت در ہر کمال عبارت است از حصول مشابہت تامہ بانبیاء اللہ در آں کمال، مثلاً علم باحکام شرعیہ..... پس مشابہ بانبیاء درایں فن ائمہ مجتہدین مقبولین اند، پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ، ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گزشتہ اند، فاما مقبول درمیان جمہور

امت ہمیں چند اشخاص اند، پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردید، بناءً علیہ درمیان جماہیر اہل اسلام از خواص وعوام بلقب ''امام'' معروف گردیدند وبقوت اجتہاد موصوف۔'' (صراط مستقیم، ص: ۹۰-۹۱، مطبوعہ: مطبع مظہری کلکتہ، ۱۲۶۵ھ)

''کسی کمال میں امامت کا مطلب یہ ہے کہ اس کمال میں انبیاء اللہ سے مشابہت تامہ حاصل ہوجائے، مثلاً احکام شرعیہ کا علم ہے کہ ....اس فن میں انبیاء علیہم السلام سے مشابہ مجتہدین مقبولین ہی ہیں، لہٰذا ان حضرات کو ائمہ فن میں شمار کرنا چاہیے، جیسے کہ حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں کہ اگرچہ مجتہدین زیادہ سے زیادہ ہوگزرے ہیں، لیکن جمہور امت کے درمیان مقبول یہی چند حضرات ہیں، پس گویا مشابہت تامہ اس فن میں انہی حضرات کے نصیب میں آئی، اسی بنا پر عامہ اہل اسلام کے درمیان چاہے وہ خواص ہوں یا عوام، یہی حضرات ''امام'' کے لقب سے معروف اور قوتِ اجتہاد سے موصوف ہیں۔''

ان حضرات ائمہ اربعہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو تابعی ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تبع تابعین کا زمانہ پایا ہے۔ ان حضرات ائمہ کی فقہ مدون ہونے کے ساتھ ہی امت میں اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا اور ان کے عہد سے لے کر آج تک تمام اہل سنت وجماعت ان ہی حضرات کی فقہ کے پیرو ہیں۔ ان حضرات کا اختلاف بھی امت اسلامیہ کے لیے رحمت ہے۔ واضح رہے کہ مجتہد سے اگر کسی مسئلہ میں خطا بھی ہوجائے تو ایک اجر ملتا ہے، ورنہ دوہرا اجر تو اس کا ہے ہی۔ حافظ ابوالمحاسن دمشقی رحمۃ اللہ علیہ ''عقود الجمان'' میں فرماتے ہیں:

''اعلم رحمک اللّٰہ أن الأمة المحمدیة فی جمیع بلاد الإسلام من أثناء القرن الثانی إلٰی زماننا ھذا –وھو سنة ثمان وثلاثین وتسع مائة– لایخرج أحد منھا إذا کان غیر مجتھد عن أن یکون مقلداً لأحد من الأئمة المجتھدین فی الفقه لأنھم کلھم علٰی ھدیً من اللّٰه تعالٰی۔'' (عقود الجمان، ص:۶، طبع حیدرآباد دکن، ۱۳۹۴ھ)

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے- اللہ تم پر رحم فرمائے- کہ امت محمدیہ میں تمام بلاد اسلامی میں دوسری صدی کے وسط سے لے کر ہمارے اس زمانے تک- کہ ۹۳۸ھ ہے- کوئی غیر مجتہد شخص ایسا نہیں گزرا کہ جو فقہ میں ائمہ مجتہدین میں سے کسی کا مقلد نہ رہا ہو، کیوں کہ یہ سب حضرات حق تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر تھے۔''

غرض اواخر عہد تبع تابعین سے لے کر آج تک امت اسلامیہ کا سواد اعظم ان ہی مذاہب اربعہ سے وابستہ رہا ہے۔ میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ بھی ''معیار الحق'' میں مذاہب اربعہ کی تقلید کو مباح قرار دیتے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

''باقی رہی تقلید وقتِ لاعلمی، سو یہ چار قسم ہے: قسم اول واجب ہے اور وہ مطلق تقلید ہے کسی مجتہد اہل سنت کے سے لاعلی التعیین، جس کو مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''عقد

الجید‘‘ میں کہا ہے کہ یہ تقلید واجب ہے اور صحیح ہے باتفاق امت........۔
قسم ثانی مباح اور وہ تقلید مذہب معین کی ہے، بشرطیکہ مقلد اس تعین کو امر شرعی نہ سمجھے، بلکہ اس نظر سے تعین کرے کہ جب کہ امر اللہ تعالیٰ کا واسطے اتباعِ اہل ذکر کے عموماً صادر ہوا ہے، تو جس ایک مجتہد کا اتباع کریں گے اسی کی اتباع سے عہدۂ تکلیف سے فارغ ہو جائیں گے اور اس میں سہولت بھی پائی جاتی ہے۔‘‘ (معیار الحق، ص:۴۱-۴۲)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور مذاہب اربعہ پر جمع ہو جانے کی برکت کہ جتنے اساسی گمراہ فرقے نکلے وہ ان چاروں مذاہب پر لوگوں کے جمع ہو جانے سے پہلے پہلے نکلے۔ جب سے لوگوں نے مذاہب اربعہ کی پیروی شروع کی، نئے نئے فرقے بننا بند ہو گئے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’تا وقتیکہ مردم بر ہر چہار مذہب استوار نشدند وتقلید ایشاں اختیار نہ کردند ہفتاد و چند فرقہ پیدا شدند وبعد از ایشاں تابعان ہمہ فرقہ ہا باقی ماندند ومذاہب دیگر مخترع نگشت۔‘‘ (فتاویٰ عزیزی، ج:۱، ص:۱۶۵، طبع: مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۴۱ھ)

’’جس وقت تک کہ لوگ چاروں مذہب پر پختہ نہ ہوئے تھے اور ان کی تقلید انہوں نے اختیار نہ کی تھی، ستر سے اوپر فرقے پیدا ہوئے اور ان کے بعد تمام فرقوں کے پیرو تو باقی رہے اور دوسرے نئے مذاہب پیدا نہ ہوئے۔‘‘

اہل بدعت، روافض کو ہمیشہ ان مذاہب چہارگانہ کے اختیار کرنے پر اعتراض رہا، چنانچہ ابن مطہر حلی نے ’’منہاج الکرامہ‘‘ میں اہل سنت پر یہی اعتراض کیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی طرف سے یہ چار مذاہب نکال لیے ہیں اور حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ’’منہاج السنۃ‘‘ میں اس رافضی کے اس اعتراض کے متعدد جوابات دیئے ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ’’تحفہ اثنا عشریہ‘‘ کے باب دوم میں روافض کے مکائد کی تفصیل بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

’’کید ہشتاد و پنجم آں کہ طعن کنند بر اہل سنت و جماعت کہ ایشاں مذہب ابوحنیفہؒ وشافعیؒ و مالکؒ و احمدؒ اختیار می کنند۔‘‘ (تحفہ اثنا عشریہ، ص:۱۰۹، طبع: نول کشور لکھنؤ، ۱۳۰۲ھ)

’’رافضیوں کا پچاسی واں فریب یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت پر طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگ ابوحنیفہ، شافعی و مالک اور احمد رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب اختیار کرتے ہیں۔‘‘

اور پھر اس طعن کا اس طرح جواب دیتے ہیں:

’’جواب ایں کید آں کہ نبی صاحب شریعت است نہ صاحب مذہب، زیرا کہ مذہب نام راہے است کہ بعض اُمتیاں را درفہم شریعت کشادہ شود وبعقل خود چند قاعدہ قرار دہند کہ موافق آں قواعد استنباطِ مسائل شرعیہ از ماخذ آں نمایند ولہذا محتمل صواب وخطا می باشد ولہذا

مذہب رابسوئے خدا و جبریل و دیگر ملائکہ نسبت کردن کمال بےخردیست۔‘‘ (ایضاً،ص:۱۰۹)

’’اس کید کا جواب یہ ہے کہ نبی صاحب شریعت ہوتا ہے نہ کہ صاحب مذہب، کیونکہ مذہب تو اس راہ کا نام ہے جو بعض امتیوں پر فہم شریعت کے سلسلے میں کھلتی ہے اور پھر وہ اپنی عقل سے چند قاعدے مقرر کرتے ہیں، ان قواعد کے مطابق شرعی مسائل ان کے ماخذ (کتاب وسنت واجماع وقیاس) سے نکالتے ہیں اور اس لیے مسائل کے نکالنے میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا، جبریلؑ، ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی طرف مذہب کی نسبت کرنا نہایت بے وقوفی ہے۔ (چنانچہ اللہ ورسول کا دین کہتے ہیں، اللہ ورسول کا مذہب نہیں کہتے)۔‘‘

اس کے بعد فرماتے ہیں:

’’مقلد را در اتباعِ شریعتِ پیغمبر از توسط مجتہد ناگزیر است ..... پس اہل سنت را در اتباعِ ابوحنیفہؒ وشافعیؒ چہ گناہ لازم آمد۔‘‘ (ایضاً،ص:۱۱۱)

’’مقلد کو پیغمبر کی شریعت پر چلنے کے لیے مجتہد کے واسطے کے بغیر چارہ نہیں....پس اہل سنت پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع کرنے میں کیا گناہ لازم آگیا۔‘‘

ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے تقلید مجتہدین اور مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے پر انکار کیا ہے، وہ روافض ہی کی تقلید کا اثر ہے، چنانچہ گزشتہ صدی میں مولوی عبدالحق بنارسی المتوفی: ۱۲۸۶ھ نے اس سلسلہ میں بڑا سخت فساد برپا کیا تھا، جس کی وجہ سے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں سخت انتشار پیدا ہوگیا تھا، یہ مولوی صاحب بھی ایک زمانہ میں تشیع کا شکار رہ چکے ہیں، چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب ’’**سلسلة العسجد فی ذکر مشائخ السند**‘‘ میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’دراواسط عمر بعض تزلزل درعقائد ایشاں ومیل بسوئے تشیع وجزء اں معرف است۔‘‘

(سلسلۃ العسجد فی ذکر مشائخ السند،ص:۳۶،طبع بھوپال۱۲۹۲ھ)

’’اپنی عمر کے درمیانی حصہ میں کچھ تزلزل ان کے عقائد میں اور تشیع وغیرہ کی طرف ان کا میلان مشہور ہے۔‘‘

یہی زمانہ ہے جب موصوف نے ’’**الدر الفريد في المنع عن التقليد**‘‘ لکھی تھی جس کا جواب مولانا تراب علی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’**سواء الطريق**‘‘ لکھ کر مولوی عبدالقادر سندیلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے چھپوایا تھا، اسی زمانہ میں شیخ احمد اللہ بنارسی نے حرمین شریفین کا سفر کیا تھا اور ۱۳۵۷ ہجری میں وہاں کے علماء سے تقلید مجتہدین کے بارے میں فتاویٰ حاصل کیے تھے اور ان سے ایک سال پہلے منشی حسن علی بنارسی نے ۱۳۵۶ ہجری میں علمائے حرمین شریفین سے اسی سلسلہ میں استفسار کیا تھا۔ یہی وہ فتاویٰ ہیں جو ’’**تنبيه الضالين وهداية الصالحين**‘‘ کے نام سے اسی زمانہ میں طبع ہوئے تھے اور پھر متعدد بار ان کی طباعت عمل میں آئی۔

مولوی عبدالحق بنارسی کے متعلق مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی: ۱۳۴۱ھ نے اپنی کتاب

''معارف العوارف فی أنواع العلوم والعارف ''میں- جو'الثقافة الإسلامیة فی الھند '' کے نام سے دمشق سے ۱۳۷۷ھ میں شائع ہوئی ہے- جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے، فرماتے ہیں:

''ومنھم من سلک مسلک الإفراط جداً وبالغ فی حرمة التقلید وجاوز عن الحد، بدع المقلدین وأدخلھم فی أھل الأھواء، ووقع فی أعراض الأئمة لاسیما الإمام أبی حنیفة وھذا مسلک الشیخ عبد الحق بن فضل اللّٰہ البنارسی والشیخ عبد اللّٰہ الصدیقی الإلٰہ آبادی وغیرھما۔'' (معارف العوارف فی أنواع العلوم والعارف،ص:۱۰۴)

''اور ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے سخت زیادتی کا راستہ اختیار کیا، تقلید کی حرمت میں مبالغہ سے کام لے کر حد سے بڑھ گئے ، مقلدین کو بدعتی ٹھہرایا اور ان کو اہل ہوا میں داخل کیا اور ائمہ کی اہانت کی ، خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ، شیخ عبد الحق بن فضل اللہ بنارسی اور شیخ عبداللہ صدیقی الہ آبادی وغیرہ کا یہی طریقہ ہے۔''

سید صاحب نے شیخ بنارسی کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے، اس سے ناظرین بنارسی صاحب کی کارگزاری کا پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو افراط وتفریط سے بچائے ۔واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

جاوید احمد غامدی

سیاق وسباق کے آئینہ میں (پندرہویں قسط)

مولانا فضل محمد یوسف زئی

ثبوتِ زنا کے لیے چار گواہوں سے متعلق غامدی کا نظریہ

’’حدود وتعزیرات‘‘ کے بڑے عنوان کے تحت دفعہ:۶ کے ضمن میں غامدی صاحب ثبوتِ زنا کے لیے چار گواہ پیش کرنے کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’اسی طرح زنا کے جرم میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں چار گواہ ہی طلب کیے جائیں اور وہ اس بات کی شہادت دیں کہ انہوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالت مباشرت میں دیکھا ہے، قرآن وحدیث کی رو سے یہ شرط صرف اس صورت میں ضروری ہے جبکہ مقدمہ الزام ہی کی بنا پر قائم ہوا ہو اور الزام ان پاک دامن شُرفاء پر لگایا جائے جن کی حیثیت عرفی ہر لحاظ سے مسلم ہو اور جن کے بارے میں کوئی شخص اس بات کا تصور بھی نہ کرسکتا ہو کہ وہ کبھی اس جرم کا ارتکاب کرسکتے ہیں۔ (منشور، ص:۱۸)

تبصرہ:.....اپنے منشور کی اس دفعہ میں غامدی صاحب نے جرم زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کے مہیا کرنے کو غیر ضروری قرار دیا ہے، گویا ان کے نزدیک جرم زنا بھی عام جرائم کی طرح ہے جس میں دو گواہ کافی ہیں، یہی غامدی کا ذہنی نظریہ ہے، لیکن قرآن پاک میں چار گواہوں کی تصریح موجود ہے، اس لیے غامدی صاحب اس سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے عجیب منطق بنا کر کئی صورتیں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چار گواہ اس وقت ضروری ہیں جبکہ مقدمہ الزام کی صورت میں ہو، یعنی جب الزام کی صورت نہ ہو تو پھر زنا کے جرم کے ثابت کرنے کے لیے دو گواہ کافی ہیں۔ نیز یہ الزام شرفاء اور پاکدامن لوگوں پر لگا ہو، اگر قحبہ خانہ کی فاحشہ عورت ہو یا پاک دامن لوگ نہ ہوں تو پھر بھی چار گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب ’’برھان‘‘ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی شریف آدمی سے زنا کی لغزش ہوجائے تو اسلام یہی چاہتا ہے کہ اس پر پردہ ڈالا جائے اور معاشرہ میں اس کو رسوا نہ کیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ دو گواہوں کا قصہ بھی ختم ہوگیا۔

کئی فرضی صورتوں کے بعد غامدی صاحب ’’برھان‘‘ میں بطور خلاصہ یوں لکھتے ہیں:

’’ان دو مستثنیات کے سوا اسلامی شریعت ثبوتِ جرم کے لیے عدالت کو ہرگز کسی خاص طریقے کا پابند نہیں کرتی، لہٰذا حدود کے جرائم ہوں یا ان کے علاوہ کسی جرم کی شہادت ہو، ہمارے نزدیک یہ قاضی کی صواب دید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا ہے اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا ہے، اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہے۔‘‘

اس عبارت کے بعد غامدی صاحب نے ’’برھان‘‘ میں وہی لمبی عبارت لکھ دی ہے جو اس سے پہلے منشور کی دفعہ: ۵ کے ضمن میں ہم نے نقل کردی ہے، یہاں ’’برھان‘‘ میں غامدی صاحب نے یہ نئے گل کھلائے کہ یہی معاملہ غیر مسلموں کی گواہی کا بھی ہے، یعنی معاملہ قاضی کی صواب دید پر ہے، حد زنا میں وہ چاہے مرد کی گواہی قبول کرے، چاہے عورت کی گواہی قبول کرے، چاہے کافر کی گواہی قبول کرے۔ جناب غامدی صاحب نے گواہوں کی صورتوں کو اتنا الجھا دیا ہے کہ آدمی سمجھنے سے قاصر ہے، اس میں اتنے اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں آں چناں اور اتنے چوں و چرا سے کام لیا گیا ہے کہ دماغ گھوم جاتا ہے، اس کی مثال ایک منطقی کے قصہ کی طرح ہے، قصہ بطور لطیفہ ملاحظہ ہو:

’’ایک منطقی امام مسجد ایک گاؤں میں رہتا تھا، بے چارہ فقہ کے مسائل سے ناواقف تھا، گاؤں میں ایک کنواں تھا، اس میں ایک دفعہ ایک چوہا گر کر مرگیا، گاؤں کے لوگوں نے ان سے مسئلہ پوچھا کہ مولوی صاحب! بتائیے کہ کنویں میں چوہا گرا ہے، کنویں سے کتنے ڈول پانی نکالیں؟ بے چارے نے فقہ پڑھی نہیں تھی، منطق کا ماہر تھا، تو کہنے لگا چوہے کے گرنے کی کئی صورتیں ہیں: یہ چوہا چل کر کنویں میں گرا ہوگا یا دوڑتا ہوا گرا ہوگا۔ پھر یا تو خود دوڑ کر آیا ہوگا، یا کسی نے بھگایا ہوگا۔ پھر یا تو ڈر کی حالت میں گرا ہوگا یا اطمینان سے گرا ہوگا۔ پھر گرنے کے وقت اس نے چھلانگ لگائی ہوگی یا بغیر چھلانگ کے گرا ہوگا۔ تم لوگ بتاؤ کہ گرنے کی کونسی صورت تھی؟ کیونکہ ہر صورت کے لیے الگ الگ مسئلہ ہے اور الگ الگ ڈول ہیں اور الگ الگ تعداد ہے۔ لوگوں نے کہا: ہم تو ان صورتوں کو نہیں جانتے کہ چوہا کس صورت میں گرا تھا۔ منطقی نے کہا: پھر جاؤ، میں بھی نہیں جانتا کہ کس صورت پر فتویٰ دوں، پہلے صورت متعین کرو، پھر فتویٰ لے لو۔‘‘

غامدی صاحب نے شریعت مقدسہ کے اجماعی مسائل میں اسی منطقی امام کی طرح صورتیں بنا بنا کر تشکیک پیدا کردی اور پھر اپنے غلط راستے کی طرف راہ فرار اختیار کی، چنانچہ ہر جگہ وہ شقیں بنا بنا کر مخاطب کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ شریعت ہے جو منقول راستے سے آئی ہے، اس میں غامدی صاحب کی عقلیت اور عقلی گھوڑے دوڑانے کی گنجائش نہیں ہے۔

غلط راستے پر چل پڑنے اور گمراہ ہوجانے اور صحیح راستے پر قائم رہنے کی بنیادی وجہ اور فرق یہ ہے کہ مثلاً: ایک صحیح عالم اور فقیہ جب احادیث اور روایات میں تضاد یا تعارض دیکھتا ہے تو وہ صحیح محمل پر اس کو حمل کرنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی ترجیح دیتا ہے، کبھی توجیہ کرتا ہے، لیکن تمام روایات کا احترام رکھتا

ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کلام ہے، انکار نہ ہوجائے۔ یہ سلف صالحین کا طریقہ رہا ہے اور ہدایت پر استقامت کا بہترین راستہ ہے۔ فقہاء کرام کا اختلاف اور مذاہب اربعہ کا وجود اسی وجہ سے ہے۔ اس کے برعکس مثال کے طور پر ایک آزاد منش محقق اسکالر، دانشور، پروفیسر اور تجدد پسند شخص کے سامنے جب اختلافات پر مبنی روایات آتی ہیں تو وہ فوراً فیصلہ کردیتا ہے کہ یہ نبی ﷺ کا کلام نہیں ہوسکتا، کیونکہ نبی ﷺ کے کلام میں تو تعارض نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ ان روایات کو غلط کہہ کر راویانِ حدیث پر پورا نزلہ گرادیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ یہ ان غلط لوگوں کی غلط روایات ہیں، لہٰذا اس سے ماخوذ مسئلہ بھی غلط ہے۔ اس طرح وہ شخص سمجھتا ہے کہ میں نے تحقیق کرکے حدیث وسنت کی خدمت کی، لیکن حقیقت میں وہ گمراہی کے گہرے کھڈے میں جاگرتا ہے۔ غامدی صاحب اور ان کے استاد امین اصلاحی صاحب اور حمیدالدین فراہی صاحب اور غامدی صاحب کے شاگردوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے، پھر بدقسمتی سے یہ پروفیسر قسم کے لوگ غضب کے اصحاب قلم ہوتے ہیں، ان کے دل ودماغ میں دنگل مشتی اور میدان کی کشتی کا طبعی شوق ہوتا ہے، یہ ذہنی طور پر متکبر بھی ہوتے ہیں اور خود پنداری میں یہ دوسروں کو حقیر بھی سمجھتے ہیں، لہٰذا یہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں، پھر اجماعِ امت کا انکار کرجاتے ہیں، شریعت کے مسلمات کو ٹھکراتے ہیں، فقہاء اور مجتہدین کو غلطی پر تصور کرتے ہیں، مفسرین اور مدارس کے علماء کو نابلد اور ناآشنائے علم گردانتے ہیں۔ آج کل یہی معاملہ غامدی صاحب کے ساتھ ہوگیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس اللہ کے بندے نے شریعت کے تمام احکام کو اپنی عقل نارسا پر تولنے کی کتنی بڑی کوشش کی، پھر اتنی غلطیاں کیں جن کا گننا دشوار ہے، تو کس کس بات کا جواب علماء دیں گے؟ کسی نے سچ کہا ہے:

تن ہمہ داغ داغ شد   پنبہ کجا کجا نہم

''جسم سارے کا سارا زخمی زخمی ہے، ہم کہاں کہاں روئی رکھیں گے۔''

اب جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں پر امت کا اجماع ہے اور غامدی صاحب اگرچہ مگرچہ اور ایں چنیں اور آں چناں کرکے اس میں شک ڈالنے کی کوشش میں زورِ قلم لگا کر صفحات کے صفحات سیاہ کیے جارہے ہیں۔ ہم اہل مدارس زیادہ سے زیادہ ایک فقیہ کے فتویٰ تک پہنچ جاتے ہیں تو خوش ہوجاتے ہیں، ایک روایت حدیث تک پہنچ جاتے ہیں تو خوش ہوجاتے ہیں، لیکن ادھر سے غامدی صاحب جیسے لوگ بغاوت کے جھنڈوں کے ساتھ خروج کرکے آجاتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے، صرف قرآن صحیح ہے۔ جس طرح غامدی صاحب مسلسل یہی راگ اَلاپتے ہیں کہ اسلوبِ قرآن کا یہ تقاضا ہے، طرز کلام کا یہ تقاضا ہے، فلاں شاعر کا یہ شعر ہے، فلاں ادیب کا یہ ادب ہے اور عقل سلیم کا یہ فیصلہ ہے اور فطرت انسانی کا یہ تقاضا ہے، حمیدالدین فراہی نے یہ کہا ہے اور امام امین احسن اصلاحی نے یہ مطلب بیان کیا ہے، رجم اور سنگساری کی سزا کے ساتھ ہمارے فقہاء نے یہ طرفہ معاملہ کیا ہے، پھر کہتا ہے:

''برسوں کے مطالعہ اور فکر وتدبر کے بعد ہم اس کہنے پر مجبور ہیں کہ اپنے موقف کی تائید میں

انہوں نے (یعنی فقہاء نے) جتنے دلائل پیش کیے ہیں وہ سب منطقی مغالطوں پر مبنی اور بے حد کمزور ہیں، اسے پیش کرنے والے سلف وخلف کے اکابر ہی کیوں نہ ہوں طالب حق کو پوری قوت کے ساتھ اسے رد کردینا چاہیے، پھر کہتا ہے: ہماری رائے میں بہتر یہی ہے کہ ان فقہاء کے بعض دوسرے ارشادات پر تنقید سے پہلے اس اصول کی غلطی واضح کردی جائے، کیونکہ اصل کی تردید کے بعد فروع خود بخود بے معنی ہوجائیں گی۔ (برھان، ص:۳۷ کا خلاصہ)

پھر سنگساری اور رجم کی سزا سے انکار سے متعلق غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''تیسری بات ان روایات سے یہ سامنے آتی ہے کہ سنگساری جیسی شدید سزا کا قانون بیان کرنے کے لیے جو اُسلوب ان میں اختیار کیا گیا ہے، وہ نہایت مبہم اور بے حد غیر واضح ہے، پھر کچھ آگے لکھتا ہے: یہ ہے ان روایات کی حقیقت جن سے قرآن کے حکم میں تبدیلی کی جاتی ہے اور شادی شدہ زانی کے لیے رجم کا قانون اخذ کیا جاتا ہے۔ ان کے اس ابہام اور تناقض کو دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کسی انسان کے لیے سنگساری کی سزا تو بڑی بات ہے، اگر کسی مچھر کو ذبح کردینے کا قانون بھی اس طریقے سے بیان کیا جائے تو کوئی عاقل کیا اسے قبول کرسکتا ہے؟''۔ (برھان، ص:۶۲ و۶۳ کا خلاصہ)

غامدی صاحب برھان، صفحہ:۳۷ پر لکھتے ہیں:

''علم واستدلال نہ کسی گروہ کی میراث ہے، نہ کسی دور کا خاصہ، اگلوں کو اگر ایک اصول بنانے کا حق تھا تو ہمیں دلائل کے ساتھ اس کے ابطال کا بھی حق ہے، تنقید سے بالاتر اگر کوئی چیز ہے تو وہ قرآن وسنت ہیں اور ان کی تفسیر وتشریح کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کرلے، جو لوگ ہم سے پہلے آئے وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں''۔ (برھان، ص:۳۷)

تبصرہ:..... غامدی صاحب کا یہی قلبی استخفاف اور فقہاء سے قلبی بغض جو انہوں نے اکابر امت کے بارے میں اختیار کیا ہے اور اپنے لیے نئے نئے راستوں کو نکالا ہے، انہیں چیزوں نے ہمیں مجبور کیا اور ہمارے قلم میں شدت پیدا ہوگئی تو بقول غامدی صاحب میں بھی کہوں گا:

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

اوپر غامدی صاحب کی جو عبارات میں نے نقل کی ہیں، یہ غامدی صاحب کے دل کی آواز ہے، یہ ان کی کج راہی اور گمراہی کا ایک حصہ ہے، جس تک وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پہنچنا چاہتا ہے۔

ثبوتِ زنا کے لیے قرآن وحدیث سے چار گواہوں کا ثبوت

جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے قرآن مجید میں تین آیات ایسی ہیں جن میں چار گواہوں کے پیش کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، پہلی آیت سورۃ النساء کی آیت: ۱۵ ہے جو اس طرح ہے:

’’وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلاً۔‘‘ (سورۃ النساء:۱۵)

ترجمہ: ’’اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے، پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھوان عورتوں کو گھروں میں، یہاں تک کہ اٹھا لیوے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ ان کے لیے کوئی راستہ۔‘‘

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ’’ان آیات میں ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں سزا تجویز کی گئی ہے جن سے فاحشہ یعنی زنا کا صدور ہو جائے۔ پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کے ثبوت کے لیے چار گواہ مرد طلب کیے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوتِ زنا کے لیے وہ چار گواہ طلب کریں، جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں، اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے، اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔ زنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے، چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے جس سے عزت اور عفت مجروح ہوتی ہے اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اولاً تو یہ شرط لگائی کہ مرد ہی گواہ ہوں، عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے، جس کا وجود میں آنا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے، یہ سختی اس لیے اختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی، بہن ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگائیں، یا دوسرے بدخواہ لوگ دشمنی کی وجہ سے الزام اور تہمت لگانے کی جرأت نہ کر سکیں، کیونکہ اگر چار افراد سے کم لوگ زنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیئے جاتے ہیں، اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے ان پر ’’حدِ قذف‘‘ جاری کر دی جاتی ہے۔‘‘

جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے قرآن مجید میں چار گواہوں کا حکم سورۂ نور کی آیت:۱۳ میں بھی دیا گیا ہے، آیت اس طرح ہے:

’’لَوْ لَا جَآءُوْا عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْکٰذِبُوْنَ۔‘‘ (نور:۱۳)

ترجمہ: ’’کیوں نہ لائے وہ اس بات پر چار گواہ، پھر جب نہ لائے گواہ تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔‘‘

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’یعنی اللہ کے حکم اور اس کی شریعت کے موافق وہ لوگ جھوٹے قرار دیئے گئے ہیں جو کسی پر بدکاری کی تہمت لگا کر چار گواہ پیش نہ کر سکیں اور بدون کافی ثبوت ایسی سنگین بات زبان سے بکتے پھریں۔‘‘ (تفسیر عثمانی، ص:۴۶۸)

اس آیت کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں اس طرح بیان فرماتے ہیں، عربی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''**مسئلہ**:.....علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی شہادت ضروری ہے، عورتوں کی شہادت سے ثبوتِ زنا نہیں ہوتا اور چار مردوں سے کم کی شہادت بھی کافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''**فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ**'' .....''عورتوں کے زنا پر اپنے میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) چار مردوں کی شہادت لو۔'' دوسری آیت میں ہے: ''**لَوْ لَا جَآءُوْا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ**'' ..... ''انہوں نے اس بات پر چار مرد گواہ کیوں پیش نہیں کیے۔'' (تفسیر مظہری، ج:۸، ص:۲۴۹-۲۵۰)

قرآن مجید میں سورۂ نساء کی آیت: ۱۵، سورۂ نور کی آیت: ۴، ۶، ۸ اور ۱۳ میں صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جرم زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کے پیش کرنے کا حکم دیا ہے اور غامدی صاحب کہتے ہیں کہ زنا کے جرم میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں چار گواہ ہی طلب کیے جائیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے منشور کے ص: ۱۸ پر لکھا ہے، بہرحال ان پانچ آیتوں کی تفسیر میں مفسرین نے چار ہی گواہوں کی صراحت اور تفصیل بیان کی ہے۔

تفسیر مظہری، تفسیر معارف القرآن اور تفسیر عثمانی کی تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ سارے مفسرین نے اسی طرح تفسیر فرمائی ہے، فقہائے کرام میں بھی کسی کا اختلاف نہیں، بلکہ چار گواہوں کی پیشی پر سب کا اتفاق ہے، صرف جاوید احمد غامدی نے کسی دلیل کے بغیر خواہ مخواہ قرآن وحدیث اور مفسرین وفقہاء کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے۔ غامدی صاحب نے ان آیات میں مقدمۂ زنا کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، ایک مقدمہ الزام اور دوسرا غیر الزام۔ میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ مفسرین میں سے کسی نے الزام اور غیر الزام کی بات نہیں کہی ہے، قرآن وحدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ نہیں ہے، پھر آپ کیوں ''اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں وآں چناں'' کرکے مختلف صورتیں بناتے ہیں؟ اور اسلام کے اجماعی عقیدے کے خلاف منشور میں دفعہ بنا کر درج کرتے ہیں؟ پھر منشور میں جو کچھ لکھتے ہیں، اپنی کتاب ''برھان'' کے صفحہ: ۲۶ میں اس کے برعکس لکھتے ہیں، ''برھان'' کی عبارت بھی ایک ہی صفحہ میں آپس میں متضاد ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے، اتنی محنت کرکے ایک غلط مقصد تک پہنچنے کی ضرورت کیا تھی، جمہور امت کے راستے پر چل پڑتے تو کیا آفت آتی؟

زنا پر احادیث سے چار گواہوں کا ثبوت

ثبوتِ زنا کے لیے چار گواہوں کے مہیا کرنے کی واضح اور قطعی حدیث امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب اللعان'' میں ذکر کی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''**وعن أبی هریرة رضی اللّٰه عنه قال: قال سعد بن عبادة رضی اللہ عنہ: لو وجدت مع أهلی رجلاً لم أمسه حتی أٰتی بأربعة شهداء؟ قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: نعم الخ ۔**''

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے (آنحضرت ﷺ سے) کہا کہ: اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ زنا کرتے ہوئے کسی شخص کو پالوں تو کیا میں اسے ہاتھ لگائے بغیر چار گواہوں کو ڈھونڈ کر لاؤں گا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں!۔'' (مشکوٰۃ، ص:۲۸۶)

زنا کے اقرار کی صورت میں آنحضرت ﷺ نے چار گواہوں کے قائم قام چار دفعہ اقرار کو لازم قرار دیا، چنانچہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ وغیرہ سے چار دفعہ اقرار کے بعد فیصلہ فرمایا، مشکوٰۃ کی ''کتاب الحدود'' میں سات واقعات مذکور ہیں جن میں ثبوتِ جرمِ زنا کے لیے چار گواہوں کا ثبوت ملتا ہے، پھر آنحضرت ﷺ نے اس پر رجم کا حکم نافذ کیا۔ غامدی صاحب بہت بڑا بدنصیب آدمی ہے جو رسول ﷺ کے فیصلوں کا انکار کرتا ہے اور احادیث کو رد کرتا ہے۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ غامدی صاحب مطلق زنا کے بارے میں کوڑوں کی سزا پر زور دیتے ہیں اور رجم کا انکار کرتے ہیں، اس نے کئی کئی تحریفات کیں اور کئی احادیث کا انکار کیا اور اکابر امت کے رجم کے فیصلوں سے راہِ فرار اختیار کیا ہے۔ بخاری ومسلم کی صحیح احادیث کو غلط اور کمزور قرار دیا اور کہا کہ اس کی بنیاد پر تو ایک مچھر کو بھی ذبح نہیں کیا جاسکتا، سنگساری تو بڑی چیز ہے، چونکہ سنگساری کی سزا کے لیے چار گواہوں کی گواہی ضروری ہے، تو غامدی صاحب اسلام سے چار گواہوں کی گواہی کو غائب کرنا چاہتا ہے، تاکہ نہ چار گواہ ہوں اور نہ رجم کی سزا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ غامدی صاحب اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی چیز میں موت کی سزا کے قائل نہیں ہیں، اس لیے اس نے چار گواہوں کا انکار کیا، تاکہ اس کی وجہ سے رجم اور قتل کا ثبوت نہ ہوجائے اور ان کے مقرر کردہ مذکورہ مُدَّعا کے علاوہ کہیں سے موت کی سزا ثابت نہ ہوجائے، ان سے اگر پوچھا جائے کہ مرتکب زنا کی یہ قسمیں آپ نے کہاں سے نکالی ہیں کہ الزام شرفاء پر لگا ہو اور جن کی حیثیت عرفی ہر لحاظ سے مسلم ہو اور مقدمہ الزام کا ہو۔ خدا کا خوف کرو، امت کی شاہراہِ اعظم کو چھوڑ کر بھٹکے ہوئے پھرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان کے ساتھ رہو یا خاموش رہو۔ موشگافیوں میں پڑ کر کج بحثی میں خیر نہیں ہے۔

جاوید غامدی کا ایک خطرناک نظریہ

جاوید غامدی صاحب نے مضمون نگاری اور قلمکاری کے دبیز پردوں میں اسلام کی مکمل بخیہ گری کی ہے، اسلام کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچا ہے جس میں غامدی صاحب نے ہاتھ کی صفائی کے ساتھ ہاتھ نہ مارا ہو۔

لیکن غامدی صاحب کا ایک خطرناک نظریہ جو اُن کے کلام وتحریر سے مترشح ہوتا ہے، خدا نہ کرے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہو، لیکن ان کے بعض الفاظ اور تحریرات انتہائی خطرناک ہیں اور وہ یہ کہ غامدی صاحب اصل پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ رہے ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کو صرف چند اضافوں کے ساتھ دین ابراہیمی کا مجدد قرار دے رہے ہیں، اسی لیے غامدی صاحب اکثر مسائل کے اثبات میں

آنحضرت ﷺ سے قبل عرب معاشرہ اور جاہلیت کے طور طریقوں اور ان کے اشعار کو مدنظر رکھتے ہیں اور اسی پر زور دیتے ہیں، خدا کرے ایسا نہ ہو، لیکن اگر ایسا ہوا تو شاید غامدی صاحب اسلامی دنیا میں انسانیت کے حوالہ سے بدترین اور سیاہ ترین آدمی ثابت ہوں گے، غامدی کی عبارات ملاحظہ ہوں:

ا:..... ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔'' (میزان، ص:۱۰، طبع دوم)

غامدی کی کتابوں میں اس طرح کی عبارات مختلف مقامات پر موجود ہیں، اس سے مترشح ہو رہا ہے کہ غامدی نبی اکرم ﷺ کو دین ابراہیمی کے لیے مجدد اور مصلح سمجھتے ہیں، مستقل نبی تصور نہیں کرتے۔

اوپر تحریر کردہ عبارت کی تائید اور نظریہ میں مزید عبارات ملاحظہ ہوں، غامدی صاحب اپنی کتاب ''میزان'' ہی کے صفحہ:۴۸ پر لکھتے ہیں کہ:

۲:..... ''دین کے مصادر ومآخذ قرآن کے علاوہ دین فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی اور قدیم صحائف ہیں۔'' (میزان، ص:۴۸، طبع دوم)

اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ نے انہیں صحائف ومصادر ومآخذ سے دین اسلام کشید کر کے امت کے سامنے پیش کیا ہے۔ (نعوذ باللہ!) غامدی کی ایک اور عبارت ملاحظہ ہو:

۳:..... ''سنت صرف افعال کا نام ہے، اس کی ابتدا حضرت محمد ﷺ سے نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ہے۔'' (میزان، ص:۱۰و۶۵، طبع دوم)

یہ عبارت بالکل واضح ہے کہ دین کے افعال واعمال کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہے، آنحضرت ﷺ صرف مجدد کی حیثیت سے آئے ہیں۔ غامدی کی ایک اور عبارت ملاحظہ ہو:

۴:..... ''سنت قرآن سے مقدم ہے۔'' (میزان، ص:۵۲، طبع دوم)

اس عبارت میں غامدی صاحب نے کھل کر اپنے نظریہ کا اظہار کیا ہے، کیونکہ جب سب کچھ دین ابراہیمی ہے اور سنت ابراہیمی قرآن سے بہت پہلے اور قرآن پر مقدم ہے، لہٰذا وہی نتیجہ آ گیا کہ نبی اکرم ﷺ ایک مصلح اور مجدد کی حیثیت سے آئے ہیں، نظام اسلام پہلے سے موجود تھا، غامدی کے نظریہ میں یہی ہونا تھا جو ہو گیا اور اس نے یہی کہنا تھا جو کہہ گیا۔ غامدی کی ایک اور عبارت ملاحظہ ہو:

۵:..... ''سنت صرف ستائیس اعمال کا نام ہے۔'' (میزان، ص:۱۰، طبع دوم)

چونکہ غامدی کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی حیثیت ایک مجدد کی ہے، لہٰذا ان سے ثابت شدہ ہزاروں سنتوں کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے، حیثیت انہیں سنتوں کی ہے جو قرآن سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ثابت شدہ ہیں اور وہ غامدی صاحب کے نزدیک ستائیس ہیں، کبھی چالیس بھی کہہ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں غامدی صاحب کا عقیدہ ونظریہ یہی ہوگا جو ان عبارات سے مترشح ہوتا ہے، خدا کرے ایسا نہ ہو، لیکن غامدی صاحب اپنے علم وقلم کے باوجود گیند کی طرح جو لڑھکتا ہوا نظر آتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ اس

کا دماغ جو چکر کھاتا ہوا نظر آتا ہے، شاید اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے اسلام کی بنیادیں ہل گئیں ہیں۔ غامدی صاحب جاہلیت قدیمہ وجدیدہ کے عربی قصائد سے چوٹی کے اشعار لالاکر سامعین پر ادبی رعب جماتے رہتے ہیں، دیوان حماسہ اور السبع المعلقات وغیرہ سے اپنے مطلب کے اشعار سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں غامدی صاحب کے عربی اور اُردو ادب کا اعتراف کرتا ہوں، لیکن دین اسلام کی بنیاد ادبی چٹکلوں پر نہیں ہے۔ نیز ادبی ذوق کی ان راہوں میں غامدی صاحب اگر دیکھیں تو کئی اور مسافروں کو بھی ان راہوں میں پالیں گے، میدان کو خالی نہ سمجھیں۔ غامدی صاحب کی جدید تحقیقات انیقہ کے صلہ میں انہیں کا ایک شعر ان کی خدمت میں پیش خدمت ہے جو غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''برھان'' کے خاتمہ پر آخری سطر میں ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کے لیے لکھا ہے:

نگاہ تیری فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ
تیرا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

اللہ تعالیٰ ہمیں ''إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا'' پر استقامت عطا فرمائے۔ اور ''قُلْ أٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ'' پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں غامدی صاحب کے شعر کو غامدی صاحب ہی کے لیے پیش کر کے بات ختم کرتا ہوں:

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دُشمنانِ وقت کی طرف سے

محاذوں کی تکثیر اور اُسوۂ نبی اکرم محمد ﷺ

مولانا نور عالم خلیل اَمینی ، دار العلوم دیوبند، انڈیا

ہم مسلمانوں کے لیے کائنات کی ہر چیز کی طرح دِنوں اور سالوں کے اُلٹ پھیر اور ان کی آمد و رفت میں بھی بے پناہ عبرت کا سامان موجود ہے۔ ہجری سال کی آمد تو بہ طورِ خاص حق و باطل کی معرکہ آرائی میں حق کی جیت کے تعلق سے فیصلہ کن موڑ اور باطل کی یقینی شکست کے واضح اور غیر مبہم اشارے کی یاد تازہ کر جاتی ہے اور فرزندانِ حق کو یہ یاد دہانی کراجاتی ہے کہ شر کی بادِ صرصر، باطل کی دندناہٹ، کفر کی بلاخیز آندھی اور باغیانِ خدا و فرماں بردارانِ شیطان کی کرتب بازیوں وفسوں طرازیوں کے ہمہ گیر جھکڑوں کے باوجود جن سے بہت سی مرتبہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا کہ حق کا خیمہ ہمیشہ کے لیے اُکھڑ جائے گا اور خیر کا وجود درہم برہم ہوجائے گا اور اس کے ہم نواؤں کے تمام کیے دھرے پر ہمیشہ کے لیے پانی پھر جائے گا، اُنہیں مایوسی اور ناامیدی کے آگے سپر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ باطل کی انتہائی شرانگیزی اس کی حرکت مذبوحی ہوا کرتی ہے، کیوں کہ اس کا نصیبہ ہی شکست خوردگی اور بالآخر زیر ہوجانا ہے۔

حق و باطل کی آج کی کش مکش کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کش مکش دونوں کے درمیان اسی وقت سے جاری ہے جب سے دونوں کا وجود ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک دونوں کا باہم پایا جانا خدا کو منظور ہے۔ کش مکش کے رنگ و آہنگ زمانے اور جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے تبدیل ہوتے رہیں گے، لیکن کش مکش کی حقیقت تبدیل نہ ہوگی۔ بعض دفعہ ایسا محسوس ہوگا کہ باطل کا حملہ بے نظیر ہے اور ایسا بھرپور ہے جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی؛ لیکن درحقیقت' باطل کی یورش ہمیشہ ہی انتہائی قوت کے صرفے پر مبنی ہوگی، زمانے اور جگہ کے فریم میں وہ ہمیشہ غیر معمولی ہوتی ہے، دوسرے زمانے کے تناظر میں وہ معمولی معلوم ہوتی ہے۔

بہ ہر صورت حق کے ساتھ باطل کی لڑائی کل بھی جاری تھی، آج بھی جاری ہے۔ کل تیر وتفنگ اور سیف وسناں کا زمانہ تھا، آج توپ وٹینک، میزائل اور بم، فضائی کارزار اور سائنس کے بازار کا زمانہ ہے؛ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ حق کے ساتھ باطل کی کل کی جنگ آسان، ہلکی اور قابل تسخیر تھی اور آج کی

جنگ بہت سخت گمبھیر اور ناقابل تسخیر ہے۔ کل کے چوکھٹے میں کل کی جنگ اتنی ہی دشوار گزار تھی، جیسی آج کے حالات کے دائرے میں آج کی جنگ۔ کل حق کا دفاع کرنے والے کل کے لوگ تھے اور آج حق کا دفاع کرنے والے آج کے لوگ ہیں۔ حق کی کل کی جنگ اہل حق نے جیت لی تھی، آج کی حق کی جنگ بھی اہل حق بالآخر جیت لیں گے، ان شاء اللہ! لیکن شرط یہی ہے کہ کل کے اہل حق ہی کی طرح آج کے اہل حق میں اخلاص، جذبۂ قربانی اور ایثار کی فراوانی ہو؛ ورنہ جنگ کا دورانیہ طویل، آزمایش کی گھڑی دراز، جیت کا موقع مؤخر، نقصان کا احتمال زیادہ اور صبر کے امتحان کی مدّت قدرے طویل ہو جائے گی، جس کی وجہ سے بادی النظر میں ایسا محسوس ہوگا کہ باطل فتح مند اور حق شکست خوردہ ہوگیا ہے اور باطل پرستوں کی طرف سے اہل حق کو دل خراش طعنوں اور خدائے حکیم کی طرف سے اصلی ونقلی ایمان کی پرکھ کے عمل سے گزرنا ہوگا، جو بہت سی دفعہ قلیل الصبر حق پرستوں کے لیے بہت مشکل ثابت ہوتا ہے۔

اسلام دشمن طاقتیں آج اسلام کے خلاف متحد ہوکر اس طرح اس پر ٹوٹ پڑی ہیں کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں کی ایسی یگانگت، ایسا اتحاد، ایسی یک جائی کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اسلام سے لڑنے، اس کا پیچھا کرنے، اس کو گھیرنے اور ہر طرف سے اس پر راہ بند کردینے کی ہر تدبیر سے کام لیا جارہا ہے، ہر ذریعے کو آزمایا جارہا ہے، ہر طریقۂ پیکار کو استعمال کیا جارہا ہے اور ایک کے بعد دوسرا محاذ کھول کر فرزندان اسلام کو ہر محاذ پر مشغول کر کے ان کی طاقت کو منتشر کردینے اور فیصلہ کن اور آخری مزاحمت سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فرزندان اسلام غافل اور محو استراحت ہیں اور دشمنان اسلام ہمہ وقت محو فکر وعمل ہیں۔

محاذوں کی تکثیر اور جنگی کارروائیوں کے مراکز کا تنوّع، اسلام سے برسر پیکار طاقتوں کے کارگر اور ترجیحی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، جس پر وہ ماضی میں بھی کاربند رہی ہیں۔ انہیں یقین رہا ہے کہ اگر اسلام کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کے محاذ ایک دو ہی رہیں گے، تو فرزندان اسلام کے لیے ان سے نمٹنا اور حساب بے باق کرنا آسان ہوگا؛ لیکن محاذوں کی کثرت اور ان کے متنوّع ہونے کی صورت میں دشمنان اسلام کے بہ زعم اہل اسلام کے لیے ان سارے محاذوں پر اُن سے لڑنا آسان نہ ہوگا، نتیجتاً وہ شکست کھا جانے، ان کے سامنے سرنگوں ہو جانے اور ان کے لیے جیت کو تسلیم کرلینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

محاذ جنگ کی تکثیر اور اس کو نوع بہ نوع کرنے کی پالیسی پر ہی آج اسلام دشمن طاقتیں عمل پیرا ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے اپنی صفوں میں اتحاد و یک جہتی کی ایسی مثال قائم کی ہے، جو دیدنی بھی ہے اور باعث عبرت بھی۔ باعث عبرت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان اختلاف و تضاد کے اتنے سارے عوامل پائے جاتے ہیں کہ انہیں کسی بھی حال میں متحد نہیں ہونا چاہیے تھا، بلکہ انہیں ہمیشہ اور ہر طرح متحارب یا متصادم رہنا چاہیے تھا۔ یہ زمانے کی نیرنگی اور اس کے عجائبات میں سے ہے کہ اختلاف کے لاتعداد محرکات کے باوجود صرف ایک محرک یعنی اسلام دشمنی نے انہیں متحد اور متعاون بنا دیا ہے۔ ان کے

عقیدے مختلف ہیں، رجحانات ومیلانات مختلف ہیں، عبادتوں اور پرستشوں کا انداز مختلف ہے، ساتھ ہی ان کے مقاصد ومفادات، ان کی نسلوں اور جنسوں، رنگوں اور ملکوں، معبودوں اور عقیدتوں کے محوروں میں نہ صرف اختلاف، بلکہ بالکل تضاد پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی کے بت پتھر کے ہیں، تو کسی کے صنم لکڑی کے، کسی کے معبود گڑے ہیں تو کسی کے کھڑے، کسی کے پڑے ہیں تو کسی کے بیٹھے! لیکن ان کے درمیان ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے اسلام دشمنی، جس نے سارے تضادات کے باوجود انہیں ایک بنادیا ہے۔ کیا یہ بات ہم مسلمانوں کے لیے درس انگیز نہیں کہ ہم مسلکوں اور مکاتب فکر کے اختلاف کے باوجود ''لا إلٰه إلا اللّٰه محمد رسول اللّٰه'' کے قدر مشترک پر متحد ہوکر باطل کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیں، تاکہ خدا کی کائنات امن کی جنت، سکون کا گہوارہ، راحت کی جا اور انسانیت کی جائے پناہ اسی طرح بن جائے جس طرح کہ خدا نے چاہا ہے اور خدا کے نبی (ﷺ) نے جس کو برپا کرکے دکھادیا ہے!۔

محاذوں کی تکثیر کی کارروائی کے ضمن میں ہی خلافت عثمانیہ کے پرزے اُڑائے گئے، جو اپنی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی تھی۔ نیز اسی پالیسی کے تحت اللہ پاک کی محبوب ومقدس اور مبارک سرزمین، یعنی مسجد اقصیٰ وفلسطین کی بعثت انبیاء کی سرزمین میں جو خالص اسلامی اور عربی سرزمین ہے، اسرائیل کے ناپاک درخت کی زور زبردستی سے اور مکمل ظالمانہ وغاصبانہ طور پر کاشت کی گئی۔ پھر اسرائیل کو طاقت ور ترین بنادینے کے لیے کوشش کی گئی کہ وہ عسکری واقتصادی طور پر خودکفیل ہوجائے اور باقی ماندہ ارض فلسطین کو ہڑپ کرکے فلسطینیوں کو خانما برباد کردے اور جو وہاں رہ جائیں انہیں ہمہ گیر طور پر ''ادب'' سکھاتا رہے اور دوسری طرف اسرائیل کے سامنے کے عربی ممالک اور پڑوسی اسلامی وعربی ریاستوں کو اس درجہ ناتواں، غیر مسلح، بے دم اور بے دست وپا کردیا جائے کہ اسرائیل جب چاہے ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے دے اور ان کی طرف سے فرضی خوف اور عدم تحفظ کے احساس کا ڈھنڈورا پیٹ کر عالمی رائے عامّہ بالخصوص یورپ اور امریکہ کی ''ضرورت'' سے زیادہ ہمدردی اور ہم نوائی اور مادی ومعنوی تعاون سے بہرہ ور رہے۔

نیز اسی پالیسی کے تحت اسرائیل کو کھل کر اس کا موقع دیا گیا کہ وہ باقاعدہ ایٹمک ملک بن جائے اور سیکڑوں نیوکلیر ہیڈس کا مالک بن بیٹھے، دوسری طرف دوہرے پیمانے کی اساس پر، بلکہ دشمنانہ رویے کے تحت پڑوس کی ہر عربی اور پوری دنیا کی ہر اسلامی ریاست کو ''ایٹمک غلیل'' کے حصول سے بھی نہ صرف بازرکھا گیا، بلکہ اس حوالے سے محض سوچنے پر بھی نہ صرف یہ کہ بدترین انجام کی دھمکی دی گئی، بلکہ ''خارش زدہ اونٹ'' کی طرح اس کو پوری دنیا سے الگ تھلگ کردینے اور اس کی شبیہ کو ایسا مکروہ بنادینے کی کوشش صرف کی گئی کہ عالمی برادری کو اس سے ہمیشہ کے لیے گھن آجائے اور اس پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑنے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے لیے وقت، مال، سیاست کاری، سفارت کاری، دھونس دھمکی کا اتنا بڑا اَثاثہ صرف کیا گیا کہ اس سے بہت کم اَثاثے کے ذریعے دنیا کی ساری بے انصافیوں کا علاج، غربت کا

خاتمہ، ناخواندگی کا انسداد، بیماریوں کا صفایا، استبداد کے تریاق کی تلاش اور الجھے ہوئے معاشی اور سیاسی مسئلے کا معقول اور اطمینان بخش حل ڈھونڈا جاسکتا تھا، بشرطیکہ نیت سچی ہوتی، انسانیت کا واقعی درد ہوتا، ظلم سے سچ مچ نفرت ہوتی، اسلام دشمنی سے عقل کی بصیرت اور آنکھ کی بصارت سے محرومی کا روگ اہل مغرب اور امریکہ کے لیے لاعلاج بیماری نہ بن گیا ہوتا اور دوہرے پن، نفاق اور عصبیت کی تہ بتہ تاریکیوں کی وجہ سے ان کے دل اور ضمیر کا چپہ چپہ شب دیجور کے لیے شرمندگی کا باعث نہ ہوگیا ہوتا۔

اسلام کے خلاف تکثیر محاذ ہی کی پالیسی کے تحت بڑے ممالک بالخصوص امریکہ اور یورپ نے اپنے لیے ایٹمک پروگراموں کی تخلیق، تعمیر اور ترقی کو نہ صرف جائز رکھا، بلکہ ان گنت نوع کے جہنمی اسلحے اور وسیع تر تباہی کے ہتھیار بنائے اور اہل مشرق بالخصوص مسلمانوں پر انہیں آزمایا اور انہیں اپنا غلام بنائے رکھنے اور ترغیب وتخویف کے ذریعے ان کی دولت کو چوسنے کے ساتھ ساتھ، ان کی تہذیب وثقافت، تعلیم وتربیت، دین وروایت، طرزِ زندگی اور نظام حکومت کو مغربی اور امریکی بنادینے کی کوشش کی اور ہنوز کررہے ہیں اور حکم دیا جارہا ہے کہ جو کہا جارہا ہے وہی کرو، ورنہ ہم تم سے کروانے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔

دنیا والے امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں سے جن کے پاس زبردست نیوکلیر پروگرام، نیوکلیر اسلحے اور تباہ کن عسکری صلاحیتیں اور ظالمانہ ریکارڈس اور سابقہ جارحانہ عزائم کا پشتارہ موجود ہے اور جو اپنی غیر معمولی عسکری صلاحیتوں کی وجہ سے ہی پوری دنیا کو روندنے میں لگی ہوئی ہیں اور پاگل پن اور طاقت کے نشے سے چورسانڈ کی طرح ہرقوم، ملک، تہذیب وثقافت اور تاریخ وروایت سے سرٹکراتی اور سینگ لڑاتی پھررہی ہیں، ان طاقتوں سے دنیا والے یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم کو اگر واقعی انسان کی تباہی اور دنیا کی بربادی کا خوف ستارہا ہے، تو دنیا کے کمزور ملکوں پر نیوکلیر پروگرام سے دست برداری کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے زور ڈالنے سے پہلے تم اپنے اپنے تباہ کن نیوکلیر پروگراموں سے از خود دست بردار کیوں نہیں ہوجاتے، تاکہ تمہارا عمل سبھوں کے لیے خود دعوت عمل بن جائے؟ تم دوسروں کو غیر مسلح ہوجانے کی دعوت دیتے ہو اور خود اسلحے کے سب سے بڑے خالق، تاجر، برآمدکنندہ اور ان کے ذریعے ظلم وجارحیت کے سب سے بڑے علم بردار بنے بیٹھے ہو۔ دنیا سب سے زیادہ تمہارے ہاتھوں ہی برباد ہورہی ہے، پوری دنیا عموماً اور عالم اسلام خصوصاً صرف تمہاری ہی دہشت گردی سے زیروزبر ہورہا ہے اور انسانیت کی قبا تمہارے ہاتھوں ہی چاک ہورہی ہے۔ تم اگر ظلم سے ہاتھ اٹھالو تو دنیا از خود امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ ظلم کے سارے انداز تمہارے ہی تراشیدہ ہیں، بگاڑ کی ساری راہیں تمہی نے دکھائی ہیں، شر وفساد کی ساری طرحیں تمہی نے ڈالی ہیں۔ تمہارے زوال کے دور میں انسانیت بدامنی سے ناآشنائے محض تھی، تمہارے عروج نے دنیا کو جہنم کدہ بنادیا ہے۔

الغرض اے امریکہ والو! اور اے فرزندانِ مغرب! اور اے بڑی طاقتوں کے برے لقب سے جانے جانے والو، جو ظلم اور ناانصافی کا رَمز بن چکا ہے! تم قول وعمل کے تضاد سے جس وقت ''شفایاب''

ہو جاؤ گے، یہ چھوٹے چھوٹے ممالک از خود راہِ راست پر آجائیں گے، جو پہلے سے بھی تمہاری طرح بے راہ رو اور ظلم و جارحیت کے پجاری نہیں ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ زبردست تباہی کے ہتھیاروں کے طفیل ہی تم نے دنیا پر اپنی چودھراہٹ قائم کر رکھی ہے اور اپنی چودھراہٹ کو دوام اور استحکام دینے کے لیے کمزور ملکوں کو بالکل تہی مایہ ہو جانے اور اسلامی ملکوں کو تو اور بھی بالکل بے شناخت ہو جانے کی نہ صرف دعوت دیتے ہو، بلکہ زور زبردستی سے اپنا حکم ان سے منوانا چاہتے ہو؟ یہ انصاف کی کون سی منطق ہے کہ تم تو پہلے سے زیادہ طاقت ور اور عسکری صلاحیتوں کی افزودگی اور ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ گئے اور تمہارا سفر ہنوز تیز گامی سے اور سامانِ صد ہزار کے ساتھ خوب سے خوب تر منزل کی طرف جاری ہے اور تم دوسروں سے کہتے ہو کہ ٹھہر جاؤ، رک جاؤ، بیٹھ جاؤ، بلکہ ذلت اور رسوائی کی نیند سو جاؤ؟۔

اسلامی ملکوں سے بالخصوص اور دنیا کے دیگر کمزور ملکوں سے جنہیں تم نے اپنی چالاکی سے کمزور رہنے دیا ہے اور ترقی کی راہ پر ان کے چلنے کو ''دہشت گردی'' قرار دیتے ہو، تمہاری لڑائی، کلچر، تہذیب، تاریخ، روایت، مذہب، طرزِ زندگی اور طرزِ حکومت کی عصبیت کے ساتھ ساتھ، اس لیے بھی ہے کہ وہ ترقی اور اٹھان کی راہ پر چلنے کی محض سوچتے کیوں ہیں؟ جب کہ یہ حق تمہارے بہ زعم خدا کی طرف سے صرف تمہی کو عطا کیا گیا ہے!

ذرا دیکھو تو سہی تم نے اسرائیل کے لیے، اس کی برتری کے لیے، عربوں کے بالمقابل اس کی عسکری و اقتصادی طاقت کو دوبالا کرنے کے لیے، انصاف کا کتنا خون کیا ہے؟ بے انصافیوں کی کتنی نئی نئی فصلیں اُگائیں ہیں؟ طرف داری بے جا کے کتنے نئے نئے اور عجیب عجیب بیج بوئے ہیں اور وعدوں، معاہدوں، الفاظوں اور تعبیروں کے معانی اور مفاہیم کو تم نے کس کس طرح بدل کر رکھ دیا ہے؟ حق کا دفاع کرنے والے تمہارے نزدیک دہشت گرد ہیں اور ناانصافی اور ظلم محض کے اساس گزار و طرف دار تمہارے نزدیک دہشت گردی کا شکار ہیں؟ ظالم و غاصب و قاتل و جارح و درندہ صفت اسرائیل تمہارے نزدیک بے گناہ مظلوم ہیں اور مظلوم و مقتول و مجروح اور مصائب گزیدہ فلسطینی تمہاری لغت میں ظالم اور شر پسند ہیں۔ سبب کو مسبّب اور مسبّب کو سبب بنا ڈالنے کی ایسی جرأت تمہارے چچا فرعون اور تمہارے جدّ امجد شیطان کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ قول و فعل کے سارے تضاد اور الفاظ و تعبیرات کی ساری بے آبروئیوں کے تمہارے ایسے جرم آسمان کی آنکھوں اور زمین کی گود نے کیوں دیکھے ہوں گے؟

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ یہ مغربی ممالک اور امریکہ ڈھیر سارے ایٹمی ہتھیار بنائیں، بناتے جائیں، انہیں ترقی دیتے جائیں، ان کی وجہ سے دنیا والوں بالخصوص مسلمانوں کو اس طرح ڈرائیں جیسے بڑی عمر کے لوگ بچوں کو بھوت اور جن سے ڈراتے ہیں اور مسلم ملکوں اور دیگر کمزور ملکوں سے کہیں کہ تمہیں کسی طرح کے ''چاقو'' اور ''چھری'' بنانے کا حق نہیں اور اگر تم نے بنانے پر اصرار کیا تو ہم تمہیں نیست و نابود کر دیں گے۔

برطانیہ کے ’’ٹائمز‘‘ اخبار نے کچھ دنوں پہلے جو اعداد و شمار شائع کیا تھا، اس کے بہ موجب دنیا میں اس وقت (۱۷۰۰۰) ایٹمی ہیڈس ہیں، جن کے ذریعے دنیا کو کئی بار تباہ کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے تنہا امریکہ کے پاس ۷۳۰۰ ہیڈس ہیں۔ امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں اپنے نیوکلیر تجربات شروع کر دیے تھے۔ برطانیہ کے پاس ۲۲۵ ہیڈس ہیں، اس نے اپنا پہلا ایٹمی تجربہ ۱۹۵۲ء میں کیا تھا۔ فرانس کے پاس ۳۵۰ ہیڈس ہیں، اس نے پہلا ایٹمی تجربہ ۱۹۶۰ء میں کیا تھا۔ چین کے پاس ۴۰۰ ہیڈس ہیں، اس نے پہلا ایٹمی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔ روس کے پاس ۸۰۰۰ ہیڈس ہیں، اس نے پہلا ایٹمی تجربہ ۱۹۴۹ء میں کیا تھا۔ اسرائیل کے حوالے سے دنیا والوں کو یقین ہے کہ اس کے پاس سیکڑوں ہیڈس ہیں، لیکن چوں کہ وہ خود، اس کا آقا امریکہ اور اس کا پاس دار مغرب، اس کے تعلق سے ایٹمی معاملے میں بہ طور خاص مکمل طور پر راز داری برتتے ہیں، اس لیے اس کے ایٹمی ہیڈس کی تعداد کا ذرائع ابلاغ کو صحیح علم نہیں۔ شمالی کوریا بھی اپنے پاس ایٹمی ہتھیار کی موجودگی کا مدعی ہے، لیکن عالمی ذرائع کو اس حوالے سے کوئی یقینی بات معلوم نہیں۔ ہندوستان کے پاس بھی چھوٹا سا ایٹمی اسلحہ خانہ موجود جس میں ۱۲۵ ہیڈس ہیں۔ پاکستان کے متعلق جیسا کہ معلوم ہے عالمی طور پر صرف یہ خیال ہے کہ اس کے پاس شاید کچھ نیوکلیر ہتھیار ہیں، لیکن حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ (اندازاً پاکستان کے پاس بھی ۱۲۰/ تک ہیڈس موجود ہیں۔) لیکن امریکہ، اسرائیل، مغرب اور ان کے دم چھلوں نے پچھلے چند سالوں میں پاکستان اور اس کے ایٹمی پروگرام کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف جس طرح شور برپا کیا، اس سے عالم اسلام کے ضمیر کو زبردست ٹھیس پہنچی اور مسلم امّہ کو یقین کرنا پڑا کہ ساری دنیا کی اقوام و ملل یقیناً ایک فریق ہیں اور امت مسلمہ دوسرا فریق ہے اور اس کو یقین کرنا پڑا کہ ’’اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ‘‘ واقعی ایک زندہ، ناقابل تکذیب اور ہزاروں سچائیوں کی ایک سچائی ہے۔

امریکہ جس طرح عراق اور افغانستان پر قبضے کے بعد شام کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑا ہوا ہے، اس سے سیاسی مبصرین اور عالمی حالات کے اکثر ماہرین کو یقین ہو چلا ہے کہ امریکہ شام کے خلاف عسکری کارروائی کے لیے مکمل طور پر پرعزم ہے۔ جہاں تک سلامتی کونسل اور نام نہاد اقوام متحدہ کا تعلق ہے تو سارے باخبر اور حقیقت پسند ذرائع کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں عالم اسلام و عالم عرب کی ’’تادیب‘‘ کے لیے امریکہ کی کٹھ پتلی ہیں۔ امریکہ اور مغرب ان دونوں کے ذریعے اسلامی کاز کو نقصان پہنچانے اور کمزور ممالک خصوصاً عربی اور اسلامی ملکوں پر اپنی چودھراہٹ تھوپنے، انہیں غلام بنائے رکھنے اور تیل والے خلیجی ملکوں کی دولتوں کو چوسنے کا کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں ادارے کسی وقت امریکہ کے ہم رائے نہیں ہوتے (جیسا کہ عراق کے مسئلے میں ہوا تھا) تو امریکہ ان کی پروا کیے بغیر وہی کرتا ہے جو اس کو کرنا ہوتا ہے۔

امریکہ میں اسٹیج کیا گیا ۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کے دھاکوں کے واقعات کا ڈرامہ اور اس کی اساس پر ’’دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ‘‘ اور اس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کا عالمی پیمانے پر

شکار اور سارے اسلحہ اور سامان ہائے جنگ اور لشکرِ جرار کے ساتھ ہر اسلامی ملک پر یکے بعد دیگرے دھاوا اور ہر ایک کو طرح طرح سے مجبور کرنا کہ وہ اپنے ہاں نصاب ہائے تعلیم، طرزِ معاشرت اور معیشت، نظامِ حکومت وغیرہ میں بہ عجلت تبدیلی لائے، نیز ہر اسلام پسند اور دین دار مسلمان کو ''دہشت گرد'' قرار دے اور ہر دینی عالم کو ''بنیاد پرست'' باور کرے اور ہر دینی مدرسے اور اسلامی یونیورسٹی کو دہشت گردی کا اڈہ مانے اور ہر رفاہی ادارے اور انجمن کو دہشت گردی کی مؤید اور مالی مدد دینے والی تصوّر کرے اور اصلی اور صحیح اسلام کو دہشت گردی تسلیم کرے اور ایک ایسا ''معتدل'' اسلام معرضِ وجود میں لائے جو زمانے سے ہم آہنگ اور امریکہ، اسرائیل، عالمی صہیونیت اور صہیونیت سے آمیختہ مسیحیت سے ہمدردی رکھتا ہو اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے ہر بے جا برتاؤ کو خوش دلی سے گوارا کرتا ہو، جس کو صرف منافق اور مرتد ہی گوارا کرسکتا ہے اور سچا پکا مسلمان - جس کا دل اللہ و رسول (ﷺ) کی محبت اور دینی حمیت اور اسلامی غیرت سے لبریز ہو- ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ ساری پالیسیاں بھی اسلام کے خلاف تکثیرِ محاذ ہی کا حصہ ہیں۔

اسی طرح تکثیرِ محاذ ہی کا تسلسل وہ پالیسی ہے جو امریکہ نے مسلم عوام کو دین بے زار کرنے، جہاد کی تنسیخ کا عقیدہ مان لینے، نبی ﷺ کی تکذیب پر آمادہ کرنے وغیرہ کے لیے ''الفرقان الحق'' کے نام سے عربی اور انگریزی میں شائع کرکے برپا کی تھی۔ کتاب کو پڑھنے سے جہاں ایک عربی داں کو اس کی عربی سے گھن آتی ہے وہیں یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ امریکہ، اسرائیل اور ان دونوں کی پشت پناہ طاقتیں سب سے زیادہ اسلام کے تئیں مسلمانوں کی جاں نثاری سے ہی خائف اور فکرمند ہیں۔ انہیں یہی خدشہ ہر وقت بھوت کی طرح رگیدتا رہتا ہے کہ اسلام کے یہ متوالے فلسطین، افغانستان، عراق، شام اور دیگر ان جگہوں کی طرح جہاں وہ یہ باور کرلیتے ہیں کہ محض خدائے واحد کی پرستش کے گناہ کی وجہ سے ان پر عریصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے، اگر یہ ہر جگہ جان کی بازی لگانے اور اسلام کی عزت و ناموس پر مرمٹنے کے لیے سر سے کفن باندھ کے اٹھ کھڑے ہوگئے تو ہم پاس دارانِ بُتانِ ہزار نوع کے لیے زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی ٹھکانا نہ ہوگا، اسی لیے فرزندانِ تثلیث و یہود و بت پرستوں نے ہمیشہ جہاد کے بطلان اور مسلمانوں کے دلوں میں اس عقیدے کی بیخ کنی پر سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ یقیناً اسی لیے حدیث پاک میں انتہائی شدّ و مد کے ساتھ جہاد کے قیامت تک باقی رہنے کی بات کہی گئی ہے ''**الجهاد ماضٍ إلٰی یوم القیامة**'' جس سے اس کی منسوخی کی بات کہنے والے خود ننگے ہوجاتے ہیں اور ان کا ملت اسلام سے خارج ہونا ازخود عیاں ہوجاتا ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی اور آپ کی تحقیر و توہین پر مشتمل ڈنمارک اور مغرب کے ملکوں میں کارٹونوں کی اشاعت اور دفاعِ آزادیِ اظہار کے بہانے اس پر اصرار اور ہر طرح کے نقصانات کو اس حوالے سے برداشت کرلینے کے عزم کا اظہار اور کارٹون کے تخلیق کار کا صاف لفظوں میں بار

www.banuri.edu.pk

بار یہ کہنا کہ اس نے یہ کارٹون بالقصد اور سوچ سمجھ کر اس عقیدے اور ایمان کی ترجمانی کے لیے بنائے ہیں کہ اسلام کے نبی محمد ﷺ واقعی دہشت گرد، دہشت گردی کے معلم اوّل اور اس مذہب کے بانی تھے جس کی بنیاد ہی دہشت گردی پر ہے۔ نیز یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایسی فلموں کی تیاری اور نمایش جن سے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ مغرب کی نسل نو کے ذہنوں میں انتہائی خراب اور قابل نفرت بنتی ہو اور بالآخر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دلوں میں ناپسندیدگی اور عداوت پیدا ہوتی ہو اور یہ یقین راسخ ہوتا ہو اور یہ تصوّر عام ہوتا ہو کہ مسلمان وحشی، درندہ صفت اور غیر مہذب اور ناآشنائے رواداری وملن ساری لوگ ہیں اور اسلام دُور اَز کار اور فرسودہ مذہب ہے جو آج کی دنیا میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا۔

یہ اور اس طرح کی ان گنت باتیں اور اقدامات جو مغرب اور امریکہ کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے تکان کیے جارہے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا شوشہ چھوڑا جارہا ہے اور ایک کے بعد دوسری حکمت عملی روبہ عمل لائی جارہی ہے اور کسی وقت ٹھہرنے، سانس لینے، ذرا سا وقفہ دینے کی نوبت نہیں آتی۔ ان ساری باتوں کا مقصد وہی ایک کے بعد دوسرا محاذ کھولنا ہے، تاکہ مسلمان اس میں بری طرح اُلجھے رہیں کہ دفاع کے سوا ان کے پاس اقدام کی کوئی فرصت نہ ہو اور تعمیر جہاں، خلافت ارضی، جہاں بینی، اصلاحِ انسانیت اور افادۂ عام کا وہ کام نہ کرسکیں جو ان کے دینی وجود، عقائدی ساخت اور خیر امت کی حیثیت سے ان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔

یہاں ہم مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا ہے کہ حق کے خلاف باطل کی سعی پیہم، محاذوں کی تکثیر اور معرکوں کی تنوّع کاری کوئی نئی بات تھی، نہ ہے، اور نہ آئندہ ہوگی۔ باطل کے ضمیر کی گہرائی میں اپنی فیصلہ کن آخری شکست کا ایک جاوداں یقین موجود ہوتا ہے اور اس کے لاشعور میں اس کا واضح شعور محوِعمل رہتا ہے کہ اس کی ''تعمیر'' میں خرابی کی ایک صورت ضرور مضمر ہے، اس لیے وہ ہمہ وقت حق سے لرزاں اور ترساں رہتا ہے اور اس کے خلاف تگ وتاز کی ایسی کھیپ بروئے کار لاتا ہے، جو اس کے نزدیک مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے حق کی کوششوں سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ حق کو اپنے حق ہونے کا یقین اور نتیجتًا دیر یا سویر آخری فتح سے بہرہ یاب ہونے کا واضح احساس، اس کو جدوجہد کی آخری حد پار کرلینے سے روکے رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ قدرے مطمئن اور فارغ البال رہتا ہے، جو جہد وعمل کی اس خاکی دنیا میں مناسب نہیں، اسی لیے بعض دفعہ وقتی طور پر ہی سہی باطل ''جیت'' اور حق ''ہار'' جاتا ہے جو عام اور ظاہر بیں لوگوں کے لیے نہ صرف دوررَس نتائج کا حامل ہوتا ہے، بل کہ بڑی آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔

باطل کی یہ تکثیری اور تنویعی پالیسی اسی پالیسی کا تسلسل ہے جو اس نے اسلام کے آغاز میں اس کو نیست ونابود کردینے کے لیے اپنائی تھی۔ قریش نے اسلام کو اس کی گود یعنی مکہ مکرمہ، اس کے تکوینی دور یعنی مکہ مکرمہ کے اس کے ۱۳رسالہ دورانیے، پھر اس کے دار اور اس کی جائے قرار یعنی دور مدینہ منوّرہ اور اکناف بلادعرب میں اس کی ترویج کے پورے سفر میں ترغیب وتخویف، ایذا وتعذیب، ملک بدری ودیس

سے بہ جبر اخراج، لڑائی اور نسل کشی، مثلہ کرنے اور کلیجہ چبانے کے عمل، سازش و بلاک بندی، پروپیگنڈہ اور جھوٹ سچ کی صنعت گری اور ہر تدبیر کے ذریعے اسلام کی یقینی، عیاں اور روز روشن کی طرح واضح پیش قدمی کی راہ روکنے کی کوشش (جس کا ریکارڈ میں آنے والی تفصیل سے سیر و مغازی اور اسلامی تاریخ کی متعدّد الاجزا کتابیں بھری ہوئی ہیں) کے ذریعے کون سا حربہ ہے، جس کو اس نے نہیں برتا اور کون سی کوشش ہے جس کو اس نے آزمانے سے گریز کیا ہے؟۔

قریش اور ان کے ہم عصر و ہم مذہب و شریک درد مشرکین کے لیے کسی نہ کسی درجے کی جیت، خواہ وقتی سہی، اسلام کے سیل رواں کو روک دینے کے لیے- جو ہر رکاوٹ کو عبور، ہر چٹان کو پاش پاش اور اس کی راہ میں کھڑی کی گئی ہر پرشکوہ دیوار کو پار کر کے، ہر ''خس و خاشاک'' کو بہائے آگے بڑھتا جارہا تھا- حاصل ہوسکتی تھی۔ اگر اس سیل رواں کا جاری کنندہ محمد ﷺ کے سوا کوئی اور شخص ہوتا، جن کی ثابت قدمی سے پہاڑ ناآشنا اور جن کی حوصلہ مندی اور صبر سے چونٹیاں بھی نابلد اور جن کے جوش و جذبے اور زورآوری و روانی سے کسی سیل کو بھی سابقہ ہوا اور نہ ہوگا۔ آپ کی ثابت قدمی کے سامنے کفر و شرک اور ظلم و جارحیت کی ساری طاقتیں ڈھیر ہوگئیں اور ان کا لشکر جرار، بے پناہ سامانِ ضرب و حرب، تدبر و تفنن، مکر و دَسیسہ کاری، نفاق اور دہرا پن (اسلام کے خلاف ان کی ساری عسکری و غیر عسکری جنگوں میں جن کے ذریعے انہوں نے اسلام کو دوڑایا) انہیں کچھ کام نہ دے سکا اور نازک سے نازک گھڑی میں بھی وہ اسلام کے جن کو بوتل میں نہ کر سکے۔

تھک ہار کے انھوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر آزمانا چاہا، چناں چہ انہوں نے اپنے دارالمشورہ میں جس کو وہ ''دارالندوہ'' کہتے تھے، یہ طے کیا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک پٹھا و توانا و خوب صورت و شریف النسب جوان چنیں گے، ہر ایک کو ایک سیف برّاں تھمادیں گے، یہ سب طے شدہ وقت پر رات کے وقت محمد (ﷺ) کے گھر کو آگھیریں گے اور جب وہ گھر سے نکلیں گے تو سب کے سب یک بارگی حملے کے ذریعے ان کا کام تمام کردیں گے، اس طرح شر کی شاہ کلید اور فتنے کے سرچشمے سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا، روز روز کا دردِ سر ختم ہوجائے گا، محمد (ﷺ) کا خون سارے قبائل میں تقسیم ہوجائے گا، بنی عبد مناف سارے قبائل سے انتقام کی تاب نہ لاسکیں گے، سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹ پائے گی۔

انہوں نے اپنے زعم میں بڑی کامیاب تدبیر سوچی تھی اور اپنے ترکش کے آخری تیر کو آزمانے کا ارادہ کرلیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ بھی ان کی گھات میں لگا تھا۔ اللہ نے اپنے پیغام رساں فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اپنے نبی محمد ﷺ کو مطلع کردیا کہ اہل قریش اب یہ کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا آج رات تم اپنے بستر پر مت سوؤ۔ اللہ کے سجھاؤ کے بہ موجب سرکار ﷺ ان کے درمیان سے گزرے اور دروازے سے ان کے جتھے کے بیچ سے نکلے، لیکن اللہ کی حکمت سے آپ ﷺ کے نکلنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اللہ نے انہیں اپنے نبی کے دیکھنے سے نابینا کردیا اور ایک مٹھی مٹی پر سورۂ یٰسین کی بعض آیتیں پڑھ کے پھونک کر ان

کے سروں پر پھینک دی تو وہ ان میں ہر ایک کے سر پر جا پڑی۔ الغرض ''شکار'' ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

لیکن باطل کے یہ تجربہ کار نمایندے اور شرک وکفر کے یہ نام ور علم بردار وتاج دار تھک ہار کے بیٹھ نہیں گئے، بلکہ انھوں نے اپنے ''شکار'' کا اس کے آخری اور مستحکم ومحفوظ کچھار تک پیچھا کیا اور محمد ﷺ اور ان کے دنیا وآخرت کے ساتھی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو زندہ یا مردہ پکڑ لے آنے والوں کے لیے اتنا بڑا انعام مقرّر کر دیا جو اس وقت کی دنیا کے ماضی وحاضر کی تاریخ کا سب سے قیمتی اور ناقابل فہم تصوّر انعام تھا، یعنی سو سرخ اونٹ کا انعام، عرب میں سرخ اونٹ کم یاب بلکہ نایاب تھے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریشیوں نے کتنا گراں قدر انعام رکھا تھا! اس زبردست انعام نے قریش کے طاقت ور وخوش قامت شخص ''سراقہ بن جعشم'' کو بری طرح ورغلایا کہ وہ حصولِ انعام کے ساتھ تاریخی شہرت اور پایندہ تذکرے اور وسیع تر عربی معاشرے میں اس نیک نامی سے فائز المرام ہونے کے لیے کہ اس نے انسانی تاریخ کے سب سے بڑے عربی ہاشمی ''مجرم'' اور اس کے وفادار رفیق وہم راز کو پکڑ لانے کا شرف حاصل کیا ہے، محمد ﷺ کی گردِ راہ کو پانے کے لیے بے تاب ہو گیا، چناں چہ اس نے تیر وکمان لیے، تلوار کا پرتلا لٹکایا اور تاریخ کی ابدی سمت کی طرف محوِ سفر دونوں عظیم مسافروں کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتا ہوا اُن کا پیچھا کرنے کو مکہ سے روانہ ہوا، اس سمت کے عظیم مسافروں کا پیچھا کرتا ہوا جس کی ابتدا اور انتہا کو صحیح معنی میں خالق کائنات کے سوا کوئی نہیں جانتا، جو ہر چیز کا مبدا اور منتہا ہے، اس مرکز کی طرف سفر کرنے والے دونوں عظیم مسافروں کا پیچھا کرتا ہوا، جو حق کی مکمل اور آخری فتح اور باطل کی فیصلہ کن شکست کا نقطہ بننے والا تھا۔ مسکین سراقہ کو یہ پتا نہ تھا کہ وہ کوشش ناکام کی سمت میں روانہ ہوا ہے، لیکن اس کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی سعی کام یابی سے ہم کنار نہیں ہونے کی، جب ان کے قرعہ اندازی کے تیروں نے اس کو یہ باور کرا دیا کہ اس کی اس جدوجہد کی منزل صرف ناکامی ہے، اس سے قبل اس کا گھوڑا دو مرتبہ بری طرح ٹھوکر کھا چکا تھا، جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئیں اور سراقہ کی مایوسی اور انقباض کا سبب بن کر اس کے مقصد کے حصول کی راہ کو دھندلانا شروع کر چکی تھیں۔

ناکامی کے یقین کا سایہ جیسے ہی سراقہ کے سامنے گہرا ہو کر خیمہ زن ہوا، اس نے مہاجر اعظم محمد ﷺ سے امان کا وثیقہ طلب کیا اور آپ ﷺ سے ملاقات کی دستاویز مانگی۔ پھر وہ اپنے نشانِ قدم پر پیچھے لوٹ آیا، اس کی اس سفر سے ناکام رجعت کفر کی آئندہ ہمیشہ، یقینی اور ہر محاذ پر شکست کی علامت کی حیثیت رکھتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ حق وباطل کی آئندہ کی ساری کشمکشیں باطل کی بے انتہا اور بے طرح شکست پر ہی منتج ہوا کریں گی، چنانچہ صنادید قریش کی قائم کردہ بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا اسلام اپنی جاوداں فتح کی طرف سیل تیز رو کی طرح محوِ سفر رہا اور بالآخر عربوں کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے کفر وشرک کا چراغ گل ہو گیا۔ نورِ اسلام کو بجھانے کی اس کی کوشش خاک میں مل گئی۔

لیکن مشرکین وکفار نے فوراً شکست تسلیم نہیں کر لی اور نہ ہی اسلام کی مزاحمت کے حوالے سے

اپنی بے بسی کے اعتراف پر بہ جلد رضا مند ہوئے، بلکہ انہوں نے ضد، ہٹ دھرمی اور اپنی مزید ذلت کا سامان بہم پہنچانے کا عمل جاری رکھا۔ گو علیم وحکیم خدا نے یہ چاہا کہ خود انہیں اور ساری کائنات کو اس حقیقت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرادے کہ وہ ہر محاذ پر، ہر معرکے میں، ہر تدبیر کے ساتھ، ہر تیاری کے باوجود سقوط سے دوچار ہورہے ہیں، جس سے یہ عیاں ہے کہ اسلام کی جیت جہاں محض ''خود کار'' اور صرف غیبی طاقت، الٰہی قدرت اور ربانی مدد ہی کا فیضان نہیں، وہیں کفر کی شکست بھی محض تقدیر الٰہی اور خدائی ارادے کی دین نہیں، بلکہ اسلام اور کفر کے مابین کشمکش اور کھلے ہوئے مقابلے کی اس سنت پر دونوں حقیقتیں مبنی ہیں، جو خدا نے اپنی حکمت کے تحت وضع کی ہے۔ یہی سنت اور اٹل خدائی قانون اس بات کا متقاضی ہوا کہ کفر' اِسلام کی کامیاب مزاحمت نہ کرسکے اور اس کا کام تمام کردینے کی وہ کوئی چال نفع بخش طور پر نہ چل سکے، بلکہ ہر سامان کے باوجود بے سروسامان ثابت ہو، لیکن پاس دارانِ باطل نے حق پر فتح پانے کے لیے اپنی جان توڑ کوشش میں کوئی کمی نہیں کی، چشم کائنات نے مشاہدہ کرلیا کہ باطل کے ناخدا بھی بہت سے طوفانوں سے نبرد آزما ہوئے اور حق کی طرح باطل بھی جسم وجاں پر ان گنت زخم کھا کر ہی حق سے شکست کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوسکا تھا۔ تاریخ نے حق سے مقابلے کے معرکے میں اس کی جان کی بازی لگادینے کو اچھی طرح ریکارڈ کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ریکارڈ کیا ہے کہ اہل باطل اپنے باطل اور عقیدے کو حق صریح سے زیادہ سچ، سچائی سے زیادہ تاب ناک اور اپنے افسانے کو حقیقت سے زیادہ کھرا اور محسوس وجود کا مالک سمجھتے ہیں اور اپنے باطل کی راہ میں بعض دفعہ اس درجہ مارنے مرنے کو تیار ہوجاتے ہیں کہ اہل حق' حق کے لیے بھی نہیں ہوتے۔

بدر، احد، خندق، تبوک اور حنین وغیرہ بڑی اور چھوٹی جنگیں اہل باطل کے باطل پر اصرار اور حق کے مسلسل اور آخری حد تک انکار کی واضح علامتیں ہیں۔ سازشوں کے رَچنے، بلاک بندیوں کا عمل کرنے، گٹھ جوڑ کے لیے فن کاری دکھانے اور شبانہ روز کی تگ ودو میں اہل باطل نے اپنی ہمت کا جو ثبوت پیش کیا وہ باعث عبرت بھی ہے اور جائے حیرت بھی۔ انہوں نے آخری طور پر اپنے بال و پر کے کتر جانے کا اعتراف تب کیا، جب نبی خاتم محمد ﷺ نے انہیں ان کے گھر اور اصل قلعے مکہ مکرمہ میں انہیں جادَبوچا اور ان کے لیے جائے رفتن رہا نہ پائے ماندن، لیکن نبی رحمت (ﷺ) نے انہیں یک لخت معاف کردیا اور انہیں آزادی اور کسی بھی مؤاخذے سے مکمل چھٹکارے کا پروانہ عطا فرمادیا۔

ہجرت کا عظیم واقعہ ہر سال ہمیں ثبات واصرار کے ان بہت سارے معانی کی یاد دلاتا ہے، جنہیں ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اپنے قول وعمل کے جامع ترین اور ہمہ گیر اُسوے سے برپا کیا۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے مکمل سفر میں ہر کردار سے ثابت قدمی، عزم راسخ اور استقامت واستقلال کا نمونہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے کبھی کمزوری دکھائی، نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے، نہ باطنی شکست سے دوچار ہوئے، نہ معنوی ہار کا احساس کیا، نہ ذہنی سقوط کو تسلیم کیا اور نہ کسی بھی مرحلے میں یہ سوچا کہ کفر اور اس کے ہم

نواؤں کے شر وفساد، مکاری و چال بازی، دانائی وہوشیاری اور تاریک رات میں بھتنیوں کے ناچنے سے زیادہ بری طرح موت کے رقص والی جنگوں میں ان کے اپنے سارے جگر پاروں کے ڈال دینے کے عمل کو عبور نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ یہ اہل کفر اپنی ہمت وحوصلے سے نا قابل تسخیر محسوس ہوتے ہیں، اس لیے ان سے مزاحمت کر کے اپنی جان، اپنے مال، اپنے سامان اور اپنے وقت کا ضیاع کوئی عقل مندی کی بات نہیں، اس لیے ان کی جیت کو تسلیم کر کے کام کی بساط لپیٹ کر کسی اور موقع اور خدائی فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے!۔

رسول خدا ﷺ آغازِ سفر سے انجام سفر تک ٹھوس ارادے، نا قابل تسخیر صبر، نا آشنائے کمزوری، ثابت قدمی اور بے مثال اولوالعزمی کے ساتھ سر گرم عمل رہے۔ ہر طرح کی تکلیف سہتے رہے۔ ہفتہ، مہینہ اور سال دو سال نہیں، بلکہ سال ہا سال تک، یہاں تک کہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے، لیکن وفات سے قبل ہی آپ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اپنے جہد وعمل اور صبر وثبات کا میٹھا پھل چکھ لیا کہ اللہ نے اپنی روشنی کی تکمیل کر دی اور باطل کے فرزندانِ وفا کیش اس کو اپنے مونہوں سے بجھا نہ سکے۔

آج کی رات کل کی رات سے کتنی مشابہ ہے؟ کفر کے سارے پنڈے، باطل کے سارے بندے اور شیطان کے سارے تلامذہ پوری دنیا میں آج اسلام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، امریکہ ان کا قائد بنا ہوا ہے، عالمی صہیونیت انہیں ہدایت دے رہی ہے، صہیونیت زدہ مسیحیت اور عالمی صنم پرستی، اس کے ساتھ کھڑی ہے۔ سب کے سب آج اپنے سرکش دشمن یعنی اسلام پر ایک جوٹ ہو کر ٹوٹ پڑے ہیں۔ وہ ذلت، خواری اور جگ ہنسائی کے باوجود پشت پھیر کر نہیں بھاگ رہے اور اپنی شکست نہیں مان رہے، تو محمد ﷺ کے سپاہیوں یعنی مسلمانوں کو زیادہ لائق ہے کہ وہ سپر دانداز ہوں، نہ ہار مانیں، نہ کمزور پڑیں، نہ سستی دکھائیں اور نہ ان کی مزاحمت سے پیچھے ہٹنے کی سوچیں، یہاں تک کہ انہیں اپنے ''بلوں'' میں چلے جانے اور اپنی ہار مان لینے پر انہیں مجبور کر دیں۔ یہ تب ہوگا جب انہیں کاری زخم لگے گا، ان کے ضمیر کو صدمہ پہنچے گا اور جان و مال کا اتنا خسارہ انہیں لاحق ہوگا جس کے بعد انہیں زیاں کے احساس پر مجبور ہونا پڑے گا، لہٰذا اے مجاہدین حق! اے جنود محمد! اے بحر وبر میں جاہلیت اور باطل کے فرزندوں سے برسر پیکارو! تم جمے رہو، ڈٹے رہو، ثابت قدم رہو اور زخم کھا کر، عذاب جھیل کر، تکلیف سہہ کر حق کی پاسبانی سے پیچھے ہرگز نہ ہٹو۔ تقویٰ، خوف خدا کے ساتھ تمہاری مور چہ بندی کے سامنے کسی کا بس نہ چل سکے گا۔ مدد خدا کی دین ہوتی ہے، بشرطیکہ تم مدد کی شرط پوری کر لو۔ دشمنانِ خدا کو خوف زدہ کرنے والی تیاری، حکمت عملی اور انہیں ہزیمت دینے والی جرأت تمہارا سب سے بڑا، پہلا اور کارگر ہتھیار ہے، جس کے سامنے باطل کے پاسباں پہلے کبھی ٹھہرے ہیں، نہ آج ٹھہر سکیں گے۔ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو اور اس کی توفیق تمہاری ہم رکاب ہو۔

☆☆☆

حلال وحرام سے متعلق ریاست کی ذمہ داری

(دوسری اور آخری قسط)

مفتی شعیب عالم

اسلامی ریاست کی خصوصیت

شریعت کی نظر میں کچھ احکام بذاتِ خود مقصود ہوتے ہیں اور کچھ مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتے ہیں۔ ریاست لذاتہٖ مقصود نہیں، بلکہ اس کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ بہت سارے دینی احکام کا نفاذ ریاست کے تنظیمی ڈھانچہ پر موقوف ہے، جیسے اعلانِ جنگ اور حدود وقصاص وغیرہ۔ اس کے علاوہ جب اسلامی ریاست وجود میں آتی ہے تو داخلی سطح پر تو ہر مسلمان کا ضمیر اس سے احکام شرع کی تعمیل کراتا ہے، مگر خارجی سطح پر ریاست اس سے دینی احکام کی تعمیل کراتی ہے، چنانچہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے دینی احکام بیان بھی فرمائے ہیں اور ان پر عمل بھی کرایا ہے۔ اسی طرح جو شخص اسلامی ریاست کا امام ہوتا ہے، وہ ایک جانب سے عوام کا نمائندہ ہوتا ہے، مگر دوسری جانب سے وہ رسول کا جانشین ہوتا ہے اور اس نیابت اور جانشینی کی وجہ سے اس کی وہی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو خود رسول کی ہوتی ہیں، کیونکہ نائب کا وہی کام ہوتا ہے جو اصل کا ہوتا ہے۔ یہی ایک اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کا فرق ہے، ورنہ ریاست تو ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے، مثلاً زمین، آبادی اور معاشرہ ہر ریاست کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ آبادی زمین پر ہوتی ہے اور جہاں آبادی ہوگی وہاں معاشرہ بھی ہوگا اور جہاں معاشرہ ہوگا وہاں قانون بھی ہوگا، کیونکہ قانون معاشرے کی ناگزیر ضرورت ہے اور جہاں قانون ہوگا تو اس کو چلانے والا بھی ہوگا جس کو مقتدرِ اعلیٰ کہتے ہیں، مگر زمین، آبادی اور مقتدرِ اعلیٰ کی ذات سے ایک اسلامی ریاست دوسری ریاستوں سے علیحدہ اور ممتاز نہیں ہوسکتی۔ زمین اور آبادی تو ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں، اسلامی ریاست میں کوئی حقیقی حکمراں بھی نہیں ہوتا، بلکہ خود حکمران پر شریعت کی حکمرانی ہوتی ہے، اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ریاست کی شکل وصورت زمین، خطے اور معاشرے سے نہیں، بلکہ قانون اور نظامِ حکومت سے بنتی ہے۔ ریاست کا نظام خدا کا پسندیدہ اور آخری دین اسلام ہے۔ اس لیے اگر قانون اور طرزِ حکومت اسلامی ہے تو ریاست کو علیحدہ تشخص اور منفرد خصوصیت حاصل ہے، ورنہ وہ بھی ایک ریاست ہے جس

طرح دنیا کی اور ریاستیں ہیں۔

خلیفہ کی حیثیت

ہمارے حکمراں تو بہت کم پر راضی ہوگئے ہیں، ورنہ اسلام میں تو خلیفہ راشد کے اندر نبی (ﷺ) کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، چنانچہ اگر نبی ﷺ پر ایمان ضروری ہے تو امام عادل کی عدم اطاعت کو جاہلیت کی موت کہا گیا ہے، عبادات نبی ﷺ کے طریقے پر ہوں تو قابل قبول ہیں، ادھر صحت جمعہ وعیدین اور جہاد اور حدود وقصاص وغیرہ امام کے امر پر موقوف ہیں، نبی ﷺ کے قول سے کسی کو مفر نہیں تو قضاء قاضی بھی ظاہراً و باطناً نافذ ہے، سینکڑوں گواہ گواہی دیں، مگر حکم حاکم نہ ہو تو کوئی کام ثبوت تک نہیں پہنچتا۔ نبی ﷺ کی اطاعت واجب ہے تو غیر منصوص احکام میں امام کی اطاعت بھی واجب ہے اور وہ احکام جن میں شریعت کا حکم واضح نہیں ان میں جو حکمِ حاکم ہو وہی حکم شریعت ہے۔

ریاست کی ذمہ داری

ریاست کا آئین کیا ہوگا، قرآن کریم نے بیان کر دیا ہے:

’’اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔‘‘ (الحج:۴۱)

آیت میں امر بصورتِ خبر ہے اور اس میں امر سے زیادہ تاکید ہے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ ریاست کا مقصد صرف امن وامان کا قیام، صحت وتعلیم، سرحدات کی حفاظت اور عوام کی کفالت نہیں، بلکہ اس کی اور بھی ذمہ داریاں ہیں، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سرفہرست ہے۔

حلال وحرام معروف ومنکر کے تحت آتے ہیں، اس لیے یہ دونوں حکومت کی قرآنی ذمہ داری ہیں۔ جو قوم، ملک یا معاشرہ اس فریضہ کو چھوڑ دیتا ہے اسے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص گناہ کرے تو صرف وہ عذاب میں گرفتار ہوتا ہے، لیکن جب گناہ عام ہو جائے تو پھر عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ آج حالات یہ ہیں کہ خدا کی وسیع زمین مسلمانوں پر تنگ کر دی گئی ہے اور گاجر مولی کی طرح انہیں کاٹا جا رہا ہے، سر کٹتا ہے تو مسلمانوں کا، لاش گرتی ہے تو مسلمانوں کی، اموال برباد ہیں تو مسلمانوں کے، بستیاں اور شہر ملیا میٹ ہوتے ہیں تو مسلمانوں کے، دہشت ہے، وحشت ہے اور بربریت ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ہماری نااہلی بھی ہے، دشمن کی سازش بھی ہے، مگر ایک اور سبب بھی ہے جس کی طرف دھیان نہیں جاتا اور وہ یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک ہے۔

احکام کی ذمہ داری

مسلمان ہونے کے ناطے ہم سب نیکی کے فروغ اور برائی کے انسداد اور حلال وحرام کے

فکر و فلسفہ کو پروان چڑھانے اور اس پر عمل درآمد کے ذمہ دار ہیں، کیونکہ دینی احکام جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہیں اور خطاب ہم سب سے ہے، مگر اصلاً ذمہ داری حکومت اور سرکاری حکام کی ہے۔ نصوص میں خطاب اولوالامر سے ہے اور اولوالامر وہی ہیں، انہوں نے ہی اس عہدہ کی ذمہ داریوں کا حلف اٹھایا ہے اور وہی اختیار و طاقت اور قوت و قدرت رکھتے ہیں، نصوص میں وعیدیں اور بشارتیں بھی ان ہی کو سنائی گئی ہیں۔ حدیث شریف میں صاف ہے کہ: ’’**اللّٰہ سائلھم عما استرعاھم**‘‘ اللہ تعالیٰ رعیت کے متعلق باز پرس کرے گا اور جو شخص مخلوق کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو تھکاتا نہیں تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا اور جس نے اپنا دروازہ مخلوق کے لیے بند کردیا اسے خدائی دروازے بند ملیں گے۔ سرکاری منصب امانت ہے اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر اجر و ثواب ہے اور کوتاہی پر عقاب ہے۔ حکومتی طبقہ بڑی ذمہ داری تلے دبا ہوا ہے۔ یہ منصب پھولوں کا سیج اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، بلکہ خارزار ہے۔ حکومت کے ملازمین اگر اپنے فرائض کو چھوڑ کر ذکر و نوافل یا تسبیح و تلاوت میں مصروف رہیں گے تو خدا کے ہاں غافل اور مجرم شمار ہوں گے۔ فرائض، واجبات اور مؤکدات کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض انجام دیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا جو قصہ قرآن کریم میں مذکور ہے اس کا حاصل کیا ہے؟ یہی کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے عبادت خانہ کا دروازہ بند کرکے یادِ الٰہی میں مصروف ہوگئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ و تعلیم فرمائی۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ حق دار کو اس کا حق پہنچادو۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول غیر مستحق کو پہنچانا تو دور کی بات، مستحق کو بھی تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہ ہو، تم خود اس تک پہنچادو۔ حلال، پاک اور پاکیزہ غذا قوم کا حق اور اس کی فراہمی حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ حکومتِ وقت کے لفظ سے دھیان حکمران جماعت کی طرف جاتا ہے، بلاشبہ وہ اولین مخاطب ہیں اور سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی کی ہے، مگر ایک پہلو سے سول ملازمین کی ذمہ داری زیادہ ہے، کیونکہ فوجی اور سیاسی حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں، مگر سرکاری ملازمین مستقل رہتے ہیں، قانون سازی کا حق حکمرانوں کو ہے، مگر اختیارات کو استعمال میں لانا سول سرونٹس کے ہاتھ میں ہے۔

شریعت سے قطع نظر کریں تو موجودہ نظام کے حوالے سے بھی یہ حکومت کی ذمہ داری ہے، کیونکہ ڈیموکریسی کا مطلب ہی عوام کی طاقت ہے اور عوام کی طاقت کا مطلب اکثریتی رائے کا احترام ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالب طبقہ بلکہ تمام ہی طبقات حلال کے خواہاں ہیں۔ عوام کی طاقت آپ کی طاقت ہے، بانی پاکستان نے مختلف مواقع پر اس پر زور دیا ہے کہ ہر سول سرونٹ کے لیے اصل طاقت پاکستان کے عوام ہیں، اسی طرح ۱۴/اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں سول آفیسرز سے خطاب کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ آپ کسی سیاستدان یا سیاسی جماعت کے دباؤ میں نہ آئیں، اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت کو بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو ہرگز کسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔

تجاویز وسفارشات

۱:.....مذہبی جذبہ سے کام کی ضرورت

''ما کان للّٰہ یبقٰی'' بقاء اللہ تعالیٰ کو ہے اور ان کاموں کو ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جائیں، اس کے علاوہ سب فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ جو کام خلوص سے اور رضائے الٰہی سے کسی نے شروع کیے وہ پھلے پھولے اور بارآور ہوئے اور دنیا اس کے فوائد وثمرات سے مستفید ہوئی، اس کے برعکس مادی وسائل کے بل بوتے پر جو اسکیمیں شروع ہوئیں اور منصوبے بنائے گئے وہ ناکام اور ھباءً منثوراً ہوگئے۔ اگر جذبہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ہو تو خدائی مدد ساتھ ہوتی ہے اور راستہ صاف اور رکاوٹیں دور ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارا مقصد صرف حلال کی وسیع تجارت میں اپنے حصہ کا حصول نہ ہو، یہ چیزیں بطورِ انعام اللہ تعالیٰ خود نصیب فرمادیں گے، نہ ہی یورپ ہمارا آئیڈیل ہو، کیونکہ ہمارا سیاسی اور معاشی قبلہ بھی مدینہ ہے، لندن، برلن یا واشنگٹن نہیں۔

جذبہ صرف یہ ہو کہ حلال فرمانِ الٰہی اور حکم ربانی ہے اور ہمارے منصب کا تقاضا ہونے کی وجہ سے ہمارا فریضہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی محنت کی تو ملک کے ملک ان کے قدموں میں گرے اور دنیا گیند کی طرح ان کی ٹھوکروں میں تھی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث کا عنوان قائم کیا ہے: ''جزاء المؤمن بحسناتہٖ فی الدنیا'' اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے: ''مومن کو نیکی کا ثواب آخرت میں تو ملے گا ہی، دنیا میں بھی اللہ پاک اس کا اچھا بدلہ دے دیتے ہیں۔''

اس کام کو خلوص سے کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ سرکاری فرائض کی ادائیگی پر بھی اجر ملتا ہے، جب کہ حلال وحرام تو خالص دینی احکام ہیں، اگر یہ دنیوی احکام ہوتے تو بھی حسنِ نیت سے انہیں دین بنایا جاسکتا تھا۔ نیت تو ایسا مؤثر ہتھیار ہے کہ اس سے دین، دنیا بن جاتا ہے اور دنیا دین بن جاتی ہے۔ اسلام کی نظر میں دین ودنیا کا فرق کاموں کی نوعیت سے نہیں، بلکہ جذبہ اور نیت سے آتا ہے۔ جو کام خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا جائے وہ دین ہے اور اگر دین کو مخلوق کی رضا کے لیے کیا جائے تو دنیا ہے اور بدترین وبال ہے۔

۲:.....عوامی شعور وآگہی پیدا کرنا

اسلام جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس سے پہلے مناسب فضا بھی پیدا کرتا ہے، وہ سر کو جھکانے سے پہلے دل کو فتح کرلیتا ہے تو سر خود بخود اس کے سامنے جھک جاتا ہے، اس کے علاوہ ہر حکم کے ساتھ آخرت سے متعلق کوئی مضمون ضرور ہوتا ہے، کیونکہ آخرت سامنے نہ ہو تو محض قانون کے زور پر بدعنوانی ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔

۳:.....حکمت سے قانون سازی

اسلامی فلسفہ قانون کی ایک اہم خصوصیت تدریج کا اصول بھی ہے۔ ام الخبائث چار مرحلوں

میں حرام ہوئی ہے اور خود پورا اسلام یکدم نہیں بلکہ تیئیس سال میں اترا ہے۔ تدریجی قانون سازی ہلکی ہلکی پھوار کی مانند ہوتی ہے جو فصلوں کے لیے بہت مفید ہوتی ہے، جب کہ مناسب حکمت عملی سے خالی قانون سازی اس زوردار اور کڑاکے دار بارش کی طرح ہوتی ہے جو سب کچھ بہا کے لے جاتی ہے، مگر اس کے بعد زمین میں کوئی روئیدگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم نے یکدم نیشنلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کے قوانین نافذ کیے تو نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ مناسب غور وخوض، پیشگی منصوبہ بندی، واقعی صورتحال اور باہمی مشاورت کے بغیر جو قوانین بنائے جاتے ہیں وہ اسی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ قانون سازی تو ایک گہرے اور طویل غور وفکر کا متقاضی عمل ہے، مگر ہمارے ہاں میڈیا پر کوئی واقعہ اچھالا جاتا ہے جس سے جذباتیت کی ایک فضا بن جاتی ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر مقننہ قانون بناڈالتی ہے، جس میں جامعیت کے بجائے محدودیت اور گہرائی کے بجائے سطحیت اور اعتدال وتوازن کے بجائے جذباتیت اور جانبداری صاف جھلکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قانون اپنے نفاذ سے قبل ہی اپنا اخلاقی جواز کھو بیٹھتا ہے اور جب اسے نافذ کیا جاتا ہے تو وہ قوم کو ایک مقصد پر متفق اور ایک کاز پر متحد کرنے کے بجائے ان میں تقسیم کی واضح لکیر کھینچ دیتا ہے۔

۴:.....مروجہ قوانین پر ازسرنو غور

چوتھے قدم کے طور پر ہمیں حلال وحرام کے متعلق نافذ الوقت قوانین کا جائزہ لینا ہوگا۔ جو قوانین قرآن وسنت کے موافق ہوں وہ برقرار رکھے جائیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان کی اصلاح کی جائے اور جو ناقابل اصلاح ہوں انہیں کالعدم قرار دیا جائے، کیونکہ بانی پاکستان کے بقول ہم نے یہ خطہ اسلامی اصولوں کو آزمانے کے لیے حاصل کیا ہے اور ہم بحیثیت قوم خدا کے سامنے یہ وعدہ کر چکے ہیں کہ یہاں قرآن وسنت کے مخالف نہ کوئی قانون بنایا جائے گا اور نہ باقی رکھا جائے گا۔

حلال وحرام یا فقہ الحلال کا موضوع ایک جدید موضوع ہے، اگرچہ اس پر مواد بہت ہے، مگر بکھرا ہوا اور منتشر ہے۔ اگر مرتب صورت اور جدید اسلوب میں قوانین درکار ہوں تو حنفیت اور شافعیت کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے ملائیشیا کے قوانین سے مدد لی جاسکتی ہے، کیونکہ اسے اس شعبہ میں سبقت و امامت کی فضیلت حاصل ہے۔ آئی ایس او نے حلال کے موضوع پر جو معیارات وضع کیے ہیں وہ ایک گائیڈ لائن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے رہنمائی لی جاسکتی ہے، مگر اس میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو تبدیلی چاہتی ہیں، مثلاً وزارت سائنس وٹیکنالوجی پاکستان ہی کے ماتحت ادارے (پی ایس کیو سی اے) کے قانون PS 3733 : 2013 میں مشینی ذبح ممنوع ہے، مگر آئی ایس او کے قانون میں جائز ہے، اسی طرح آئی ایس او کے معیارات میں سمندری اشیاء کی حلت اور الکحل کی موجودگی کی وجہ سے پروڈکٹ کی حرمت وغیرہ ایسے امور ہیں جن میں ترمیم کی ضرورت ہوگی۔ خود وزارتِ

سائنس شرعی ماہرین کی معاونت سے غذائی مصنوعات کے بارے میں جو اسٹینڈرڈز مرتب کر رہی ہے، وہ بھی قابل تحسین کوشش ہے۔

۵:....قانون سازی کا دائرہ کار

حلال وحرام سمیت تمام شعبوں کے متعلق شریعت نے قانون سازی کی حدود متعین کردی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے قانون سازی قرآن وسنت کے مطابق ہو یا اس پر مبنی ہو یا کم ازکم اس کے مخالف نہ ہو۔ایک دوسرے پہلو سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ جن احکام کی شکل وصورت اور روح وحقیقت دونوں متعین اور مقصود ہوں ان میں قانون سازی نہیں ہوسکتی اور وہ جوں کے توں برقرار رکھے جائیں گے اور جن کی صرف حقیقت اور غایت متعین ہو، مگر شکل وصورت متعین نہ ہو ان میں حکم کی روح کو باقی رکھتے ہوئے قانون سازی ہوسکتی ہے، مثلاً: جہاد کی غرض اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور یہ متعین ہے، مگر اس کی کسی خاص شکل کو شریعت نے لازم نہیں کیا ہے، اس لیے جہاد چاہے تیروں اور تلواروں سے ہو یا توپوں اور جہازوں سے ہو' جہاد کہلائے گا۔ایک تیسرے زاویے سے یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے جو احکام لچک دار نہیں وہ تو ابدی اور حتمی قسم کے ہیں اور قیامت کی صبح تک یوں ہی رہیں گے، چاہے زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدل لے، مگر جو لچک دار احکام ہیں ان میں قانون سازی ہوسکتی ہے، شریعت کی زبان میں اول کو نا قابل تغیر اور منصوص احکام اور ثانی کو قابل تغیر وترمیم اور غیر منصوص احکام کہتے ہیں۔

۶:....حلال اسکیم کا تحفظ

حلال کے مقابلے میں حرام ہے۔حلال کی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے اس کے مقابل اور حریف کو نہ صرف اُبھرنے نہ دیا جائے، بلکہ اس کا وجود ہی ختم کردیا جائے اور ایسا صرف ریاستی قوت سے ہی ممکن ہے۔ برائی کے خاتمہ کے لیے وعظ ونصیحت اور تعلیم وتربیت کے ذریعے ذہنوں کی تبدیلی بھی ضروری ہے، مگر شجرۂ خبیثہ پر کاری ضربیں لگانا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا بھی پیغمبرانہ اسوہ ہے۔مکی زندگی تدریجی انقلاب کا منظر پیش کرتی ہے تو مدنی زندگی یکدم تبدیلی کا نمونہ ہے۔اگر حرام کی درآمد وبرآمد پر روک لگادی جائے، فوڈ انسپکٹرز اپنے فرائض تندہی اور دیانت داری سے انجام دینے لگ جائیں، غذائی مصنوعات کے لیے جو اسٹینڈرڈز مقرر ہیں ان پر پورا عمل ہو اور ریاستی سطح پر ملائیشیا کی طرح ایک ایسا ادارہ بنادیا جائے جو حلال کے شعبہ کو کنٹرول اور اس سے متعلقہ امور کی نگرانی کررہا ہو تو ممکن نہیں کہ حلال کو فروغ اور حرام کی بیخ کنی نہ ہو۔

۷:.....ناپسندیدہ قوتوں کی حلال اسکیم میں شمولیت

حلال مارکیٹ اس وقت عروج پر ہے اور میر تقی میر کے اس شعر کا مصداق بن گئی ہے کہ:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

غیر مسلم بھی اس مارکیٹ میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں، مگر معاملہ چونکہ مذہبی پہلو رکھتا ہے، اس لیے ہمیں انہیں شریعت کے مقرر کردہ حدود تک محدود رکھنا ہوگا۔

۸:....ادارۂ احتساب کی ضرورت

ہمارا مسئلہ وسائل کی عدم دستیابی یا قوانین کی کمی کا نہیں ہے۔ پاکستان میں اٹھارہ ہزار قوانین ہیں۔ اصل مسئلہ اس ہمہ گیر بدعنوانی کا ہے جو ہوا کی طرح ہر جگہ گھس گئی ہے اور اصل مسئلہ قوانین پر خلوص کے ساتھ عمل درآمد کا ہے۔ ہمارا تاجر ہر پروڈکٹ کو سو فیصد خالص اور قدرتی اجزاء سے تیار شدہ کہہ کر بیچتا ہے، دوسری طرف جو ہاتھ قانون کو نافذ کرنے والے ہیں وہ بھی کرپٹ ہو چکے ہیں۔ رعایا اور انتظامیہ میں یہ بدعنوانی اس وجہ سے پھیل گئی ہے کہ ریاستی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کردیا گیا ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ نیکیوں کو رواج دینا اور برائی کو ختم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے، اسلامی ادوار میں اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارہ ہوا کرتا تھا، جس کا مقصد ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس ادارے کا دائرہ کار بڑا وسیع تھا اور مذہب اور اخلاقیات کے دائرے میں ہوتے ہوئے ہر سرگرمی پر نظر رکھنا اس کے اختیار میں تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء سمیت مختلف پیشوں میں ہونے والی بدعنوانی اور دھاندلی کا انسداد بھی یہی ادارہ کرتا تھا۔ خود آنحضرت ﷺ سے بازار کے معاینہ کے لیے تشریف لے جانا ثابت ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ملاوٹ شدہ دودھ گرادینا بھی مشہور واقعہ ہے۔ آج پاکستان میں محتسب کا ادارہ موجود ہے، بلکہ پہلے تو صرف وفاقی محتسب ہوا کرتا تھا اور اب چاروں صوبوں سمیت آزاد کشمیر میں بھی ہے، بلکہ مختلف محکموں کے لیے بھی محتسب ہے اور محتسب کا ادارہ صرف تفتیشی ادارہ نہیں رہا ہے، بلکہ باقاعدہ عدالت بن چکا ہے، مگر اس کا دائرہ کار یہ ہے کہ جب کوئی شہری حکومت کے کسی انتظامی عمل سے نالاں ہو تو وہ محتسب سے شکایت کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک محدود دائرہ ہے اور اس سے اس ہمہ گیر بدعنوانی کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا جو ہر جگہ سرایت کرگئی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ریاستی سطح پر ایک ایسا ادارہ ہو جس طرح کہ مسلم ادوار میں ہوا کرتا تھا۔

میں ان ہی گزارشات پر اکتفا کرتا ہوں اور آپ سب حضرات خصوصاً وزارت سائنس اور سنہا کا بے حد مشکور ہوں۔ وصلی اللّٰہ وسلم علٰی سیدنا محمد النبی الأمی الکریم

☆☆☆

مدارس کا نظامِ تربیت

مولانا میر زاہد مکھیالوی (انڈیا)

تعلیم کے ساتھ طلبہ کی دینی اور اخلاقی تربیت ایک ایسا بنیادی اور حساس موضوع ہے کہ جس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے نہ صرف اہلِ علم کو بلکہ امت کے کسی باشعور فرد کو انکار نہیں ہوسکتا، بلکہ فتنوں کے ایسے دور میں جب کہ اخلاقیات میں زوال وانحطاط کے نِت نئے ذرائع اور طریقے تیز رفتاری سے ایجاد ہوتے جارہے ہیں، پورا مسلم معاشرہ اس کی زَد میں ہے، ایسے نازک وقت میں اپنے ماتحتوں کی اسلامی تربیت کی ذمہ داری یقیناً بڑھ جاتی ہے، مدارس کے طلبہ کے تعلیمی معیار کی بلندی اور ترقی کے لیے عموماً مختلف کوششیں اور طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ماہانہ، سہ ماہی تعلیمی جائزہ کا نظام بنایا جاتا ہے، مدرسوں کے بعض ذمہ دار اور تعلیمات کے نگران اس سلسلہ میں فکرمند اور سنجیدہ ہوتے ہیں، ماہرینِ تعلیم علماء سے مشاورت کرتے ہیں، وغیرہ۔ کسی بھی ادارہ کے روشن مستقبل کے لیے بلاشبہ یہ واجبی درجہ کا عمل ہے، تاہم ان طلبہ کی اخلاقی تربیت کا نظام مقرر کرنا اور صرف زبانی یا کاغذی نہیں، بلکہ اس کو نافذ العمل کرنا یہ تعلیم سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ''نظامِ تربیت'' کے شعبہ کا قیام ضروری ہے اور اس شعبہ کے فروغ وترقی کے لیے بھی ان تمام اُصولوں کو اختیار کرنا لازم سمجھا جائے جو معیارِ تعلیم کے تفوق وبہتری کے لیے عمل میں لائے جاتے ہیں۔

حضرت مفتی مہربان علی بڑوتی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: ''مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم وتربیت اور تادیب کا انتظام ہمیشہ کیا گیا ہے، خلافتِ راشدہ میں خاص طور سے اس کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے معلّم ومؤدِّب مقرر کیے گئے اور ان کو تنخواہ دی گئی، چنانچہ خاص مدینہ منورہ میں تین معلّم' بچوں کو دینی تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر ایک کو پندرہ درہم ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ (کنز العمال،ص:۹۲،ج:۲)

عہدِ سلف میں بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کو اسلامی اخلاق وآداب بھی سکھائے جاتے تھے اور اس کے لیے مشاہیر محدثین وفقہا بڑے لوگوں کے گھروں پر رکھے جاتے تھے، اچھے اشعار، قرآن شریف، خوش خطی، تیراکی، تیراندازی، بزرگوں کے واقعات اور عام مسائل کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ (کتاب المصون فی الادب، ابو ہلال عسکری،ص:۱۲۶)

خلیفہ ہارون رشید نے اپنے صاحبزادے محمد الدین کو معلّم کے حوالہ کرتے ہوئے کہا: ’’امیرالمومنین تم کو اپنے دل کا ٹکڑا دے رہا ہے، تم اس کو قرآن پڑھاؤ، اشعار اور اخبار کی روایت کرواور سنن کی تعلیم دو، اس کو بات کرنے کے موقع ومحل سے واقف کراؤ، نامناسب وقت ہنسنے سے روکواور بتاؤ کہ جب بنی ہاشم کے مشائخ کے پاس جائے تو ان کی تعظیم وتکریم کرے اور جب اس کی مجلس میں فوجی افسران آئیں تو ان کی نشست گاہ بلند رکھے، ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی کام کی بات بتاتے سکھاتے رہو۔ اس کو زیادہ کھیل کود کا موقع نہ دو، ورنہ وہ بیکاری کا عادی ہوجائے گا، جہاں تک ہوسکے اسے نرمی سے ٹھیک کرو، اگر وہ انکار کرے تو پھر سختی سے کام لو۔‘‘ (مقدمہ ابن خلدون، ص:۴۷۸)

مورخِ اسلام حضرت قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس دور میں عام طور سے بچوں کے معلّم کو مُؤدِّب (ادب سکھانے والا) کہا جاتا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم اور کتاب وغیرہ کے ساتھ اسلامی آداب واخلاق کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی اور بچہ مکتب سے نکلتا تھا تو بقدرِ کفایت دینی تعلیم کے ساتھ اسلامی تربیت سے بھی آراستہ ہوتا تھا، طبقاتِ رجال کی کتابوں میں بہت سے ائمہ اور علماء کے ذکر میں ’’المُؤدِّب‘‘ کا لقب ملتا ہے، ایسے تمام حضرات اسلامی آداب بچوں کو سکھاتے تھے اور ان کو دینی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت بھی دیتے تھے۔‘‘ (تعلیم وتربیت، ص:۲۹، مفتی مہربان علی)

مدارس میں تربیت کی ضرورت

مدارس میں طلبہ کی تربیت کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ بہت حساس واقع ہوئے تھے، اس لیے حضرت کے کلام میں اس سلسلہ کے رہنما ارشادات اور ملفوظات بہ کثرت موجود ہیں، چنانچہ حضرت کی مشہور تصنیف ’’آداب المعاشرت‘‘ میں طالب علم کے آداب کا مفصل بیان ہے، ہم یہاں موضوع کی مناسبت سے چند ارشادات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جس سے طلبہ کی تربیت کی اہمیت وضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔

۱:.....’’طلبہ میں‘‘ جس کے اخلاق خراب ہوں، اوّل اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جاوے، بات بات پر اس کو ٹوکا جاوے، اگر اصلاح کی اُمید نہ رہے تو مدرسے سے علیحدہ کیا جاوے۔

۲:.....طلبہ کے تمام افعال کی نگہداشت کرو، لباس کی بھی دیکھ بھال رکھو، ان کو لباسِ اہل علم کی ہدایت کرو، ورنہ مدرسے سے الگ کردو، صاف کہہ دو کہ اگر علم حاصل کرنا ہے تو طالب علموں کی سی صورت بناؤ، ورنہ رخصت ہوجاؤ۔

۳:.....اہلِ مدارس دینیہ تو سادہ ہی وضع میں رہیں، یہی ان کی خوبی ہے، ان کی رفتار سے، گفتار سے، نشست سے، برخاست سے، ان کے لباس سے اسلامی شان کی جھلک معلوم ہوتی ہو۔

۴:.....جس کو اپنی بات کی پیچ کرنے کا مرض ہو، وہ ہرگز پڑھانے کے قابل نہیں۔

۵:.....طلبہ کے لیے اخبار بینی کو سمِ قاتل سمجھتا ہوں، اخبار دیکھنے والوں کو تو مدرسہ سے نکال دیتا ہوں۔

۶:.....میں اس شخص کو مدرسہ میں رکھنا نہیں چاہتا جس سے دوسروں کو ایذا پہنچے۔

۷:.....طالبِ علم کے لیے میل جول ''غیر ضروری فضول، خلط ملط'' اور تعلقات ''سمِّ قاتل'' اور ''مہلک زہر'' ہے۔

۸:.....ہم تو علومِ درسیہ مروجہ مدارس عربیہ کو بھی جب کہ وہ صرف الفاظ کے درجہ میں ہو اور عمل ساتھ نہ ہو، علم نہیں کہتے۔

۹:.....بہت سی کتابیں پڑھ لینے، ''پڑھا لینے'' کا نام دین نہیں ہے، دین میں اصلاحِ اخلاق کی اصلاح فرض ہے۔

۱۰:.....بعض کہتے ہیں کہ لکھ پڑھ کر سب درست ہو جائیں گے (اس لیے زمانۂ طالب علمی میں اصلاح ودرستی کی فکر کی ضرورت نہیں) اے نادانو! اس وقت تو اور بگڑ جائیں گے (چونکہ مخلّٰی بالطبع اور آزاد ہوں گے) اس وقت (طالب علمی میں) تو دوسروں کے ماتحت ہیں، جب ابھی ٹھیک نہ ہوئے تو آئندہ مختار ہو کر کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ اُس وقت تو کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے گا کہ مولانا! آپ سے یہ کوتاہی ہوئی یا آپ نے مسئلہ کے خلاف کیا۔ درست ہونے کا تو یہ (طالب علمی کا) ہی وقت ہے۔

۱۱:.....تربیت سے قطعِ نظر کرنے کی اور ضروری نہ سمجھنے کی تو کسی حال میں گنجائش نہیں، یہ کوتاہی ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو ضروری سمجھتے ہیں، مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی ''زیادہ اور اہم'' ہے مطلق تعلیم سے، اس لیے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم علم دینا ہے اور تربیت عمل کرانا ہے اور علم سے مقصود عمل ہی ہے اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہے۔ اور تعلیم درسی سے تو ''مِنْ کُلِّ الْوُجُوْہِ'' اس لیے کہ یہ تعلیم فرضِ عین نہیں اور تربیت یعنی تہذیبِ نفس ہر شخص پر فرضِ عین ہے۔ (اصلاح انقلاب بحوالہ تعلیم وتربیت، ص: ۴۸، طبع قدیم)

(بشکریہ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند)

اشاعت خاص ماہنامہ ''بینات''

①	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
②	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
③	حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
④	حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
⑤	حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے
⑥	حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے

نوٹ منی آرڈر بھیجنے والے حضرات ایک اشاعت خاص کے لیے سو روپے ڈاک خرچ بھی ہمراہ روانہ کریں۔

علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

محمد اعجاز مصطفیٰ

۲۰ر صفر المظفر ۱۴۳۷ھ مطابق ۳ر دسمبر ۲۰۱۵ء بروز جمعرات تقریباً صبح چھ بجے محدث العصر علامہ سیّد محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہٗ کے شاگرد رشید، خواجہ خواجگان حضرت مولانا خواجہ خان محمد قدس سرہٗ کے مسترشد، اپنے وقت کے خطیب العصر، سفیر اسلام، خوش الحان خطیب و مبلغ، حضرت مولانا مفتی محمود قدس سرہٗ کے تربیت یافتہ، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی مجلس شوریٰ کے رکن، جمعیت علمائے اسلام کے عظیم رہنما حضرت علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دنیائے رنگ و بو کی ۴۷ بہاریں گزار کر خلد بریں کی طرف روانہ ہوگئے۔إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ماأعطٰی وکل شيء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔

راقم الحروف نے حضرت علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس وقت سے سنا جب وہ چھوٹا تھا اور ابھی درس نظامی شروع ہی کیا تھا اور اس وقت خطباء اور واعظین کی ایک جماعت تھی جو ملکوں، شہروں اور دیہاتوں میں جگہ جگہ اپنے مواعظ، بیانات اور خطابات کے ذریعے عام سادہ لوح مسلمانوں کے عقائد کی درستی اور توحید وسنت کی تعلیم وتبلیغ پر مامور تھی، ایک طرف تنظیم اہل سنت کے پلیٹ فارم پر علماء کی کثیر جماعت جن کے قائد علامہ عبدالستار تونسوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، عوام الناس کو دین اسلام کے بنیادی عقائد سے روشناس کرارہی تھی تو دوسری طرف تحفظِ حقوق اہل سنت و جماعت کے پلیٹ فارم سے علماء کی ایک جماعت دین اسلام کی اشاعت میں مصروف عمل تھی۔ ہر ایک عالم کے سمجھانے کا انداز دوسرے سے منفرد اور یکتا تھا۔ ہر ایک مقرر، واعظ اور خطیب اپنی جگہ ضروری تھا اور عوام ہر ایک کے بیان کو بڑی توجہ اور انہماک سے سنتے تھے، بلکہ دین سے محبت کرنے والے حضرات کو ان علمائے کرام اور خطبائے عظام کے بیانات سننے کا بڑی شدت سے انتظار ہی رہتا تھا۔ حضرت علامہ عبدالستار تونسوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبدالشکور دین پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا قاری محمد حنیف ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد لقمان علی پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا قاری محمد اجمل لاہوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالکریم شاہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا منظور احمد حجازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے چوٹی کے خطباء حضرات کے جلسوں میں بارہا ان حضرات کے سامنے بیٹھ کر ان کے بیانات سننے کا موقع ملا۔ بہرحال یہ تمام علماء کرام ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے پوری زندگی دین اسلام کی تبلیغ و ترغیب اور اس کی اشاعت وحفاظت میں صرف کردیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ توحید کو بڑے سادہ اور دلنشین انداز میں لوگوں کے قلوب واذہان میں راسخ فرماتے تھے۔ مسئلہ توحید بیان کرنے کے بعد لوگوں سے سوالیہ انداز میں پوچھتے تھے کہ: میرا اور تمہارا رب کون؟ پھر خود ہی جواب تلقین کرتے کہ: اللہ ہی۔ عزت دینے والا کون؟ اللہ ہی۔ اولاد عطا کرنے والا کون؟ اللہ ہی۔ رزق دینے والا کون؟ اللہ ہی۔ آپ فرماتے تھے کہ: ’’توحید عین انصاف ہے اور شرک عین ظلم ہے۔ جس معاشرے میں، جس سوسائٹی میں، جس ملک میں شرک کے جراثیم موجود رہیں گے، اس سوسائٹی اور اس ملک میں عدل وانصاف کی حکمرانی کبھی قائم نہیں ہوسکتی۔‘‘

علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت سے کیا، وہ اپنے منفرد بیان اور قادرالکلامی سے علمی حلقوں اور عوامی جلسوں میں مقبولیت عامہ پر پہنچے، انہوں نے از ابتدا تا انتہا پوری زندگی جمعیت علماء اسلام اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ میں گزار دی۔ یحییٰ خان کے مارشل لاء دور میں انہوں نے ایک عرصہ تک جیل بھی کاٹی۔ تحریک نظام مصطفیٰ، تحریک ختم نبوت اور قومی اتحاد کے زمانہ میں علامہ سیّد عبدالمجید ندیم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ: ’’میں نے دریا تیر کر بھی جلسوں میں شرکت کی۔‘‘ مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ دین متین کی خدمت کی اور دنیا کے ۱۳۷ ممالک میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کا قرآن سنایا اور ان کو دین کے راستے پر لگایا۔ سینکڑوں لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ توحید وسنت کی اشاعت، شرک وبدعات کے رد، تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس اصحابؓ واہل بیتؓ کے لیے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپؒ نے اپنے حالاتِ زندگی اپنی کتاب مقالات وخطابات میں کچھ اس طرح لکھے ہیں:

’’۱۹۴۱ء (ماہ صیام میں) ولادت ہوئی، والد محترم حضرت سیّد غلام سرور ابن سیّد غلام حیدرؒ کا میں اکلوتا فرزند ہوں، جو حضرت سیّد حبیب سلطانؒ کی اولاد میں سے ہیں، جن کا مرقد درگ ضلع لورالائی (کوہِ سلیمان) میں ہے۔ وہ ایک باخدا، روشن ضمیر اور عابد شب زندہ دار انسان تھے۔ قرآن پڑھنا پڑھانا ان کا وظیفہ حیات تھا۔ کوہِ سلیمانی کے دامن میں واقع دور افتادہ مقام پر چالیس سال سے زیادہ عرصہ انہوں نے ہزاروں قلوب واذہان کو قرآنی انوار وتجلیات سے معمور کیا۔ بغیر کسی اجر ومشاہرہ کے توکلاً علی اللہ سینکڑوں مسافر طلبا ان کے حلقۂ تعلیم وتربیت میں رہتے، جن کے قیام وطعام کے وہ کفیل تھے۔ قرآن کریم سے انہیں والہانہ عشق تھا اور وہ اس جذبہ سے سرشار ساری امیدیں اللہ سے وابستہ رکھتے، میں نے دنیا والوں سے استغنا کے جو مناظر ان کی زندگی میں دیکھے کہیں اور نظر نہیں آئے۔ طلبا کا کھانا ہمارے گھر ہی میں تیار ہوتا تھا۔ صبح تہجد کی نماز کے بعد والدہ مرحومہ کے ساتھ کچھ دیر خواتین چکی پر آٹا پیستیں، فجر کی نماز کے بعد دو ڈھائی سو

طلبا کے لیے روٹیاں اور دیگچوں میں سالن تیار ہوتا، تقریباً ۱۱ اور ۱۲ بجے کے درمیان کھانا دیا جاتا۔ دو بجے تک آرام اور پھر نمازِ ظہر، اس کے بعد عصر تک تعلیم، بعد عصر تا مغرب چھٹی، مغرب وعشاء کے درمیان کھانا، بعد عشاء سے رات ۱۱ بجے تک تعلیم۔ میں نے ہوش سنبھالا تو قرآنی زمزموں سے لبریز فضاؤں نے خیر مقدم کیا۔

حضرت والد محترم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے سایۂ عاطفت میں ۷ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا، لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کسی مکتب سے نہیں بلکہ جو طلبا استعداد رکھتے تھے انہی سے کچھ عرصہ رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ والد محترم (نور اللہ مرقدہٗ) فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی صورت میں جو نعمت وامانت مجھے سونپی ہے میں اس کی فکری وذہنی تعمیر کے لیے قرآن پر قناعت کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے (طالب علم کی حیثیت سے) مجھے ایک دن بھی اسکول نہیں بھیجا۔ فارسی نظم اور صرف کے ابتدائی مراحل حضرت والد محترم کے ایک قریبی دوست مولانا عبدالحق کے ہاں سر کیے، جو فاضل دارالعلوم دیوبند اور حضرت سیّد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ تلمیذ تھے۔ صرف ونحو کے لیے حضرت مولانا منظور الحق، مولانا ظہور الحق مرحوم (جو کبیر والا ضلع ملتان میں فنون وادب کے نامور استاد تھے) سے تقریباً تین سال تک اکتساب فیض کیا۔ منطق استاد دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا عبدالخالق مرحوم پڑھایا کرتے۔ دو سال ڈیرہ اسماعیل خان، بعد ازاں کراچی، لاہور میں تعلیمی عرصہ گزرا، دورۂ حدیث حضرت مولانا قاضی شمس الدین مرحوم سے گوجرانوالہ میں پڑھا۔ تکمیل وتخصیص کے آخری دو سال حضرت مولانا شیخ سیّد محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں گزارے۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں فراغت کے بعد محدود عرصہ کراچی میں ہی گزر۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں عملی زندگی میں قدم رکھا اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ سے فکری وعملی رفاقت کی۔ وطن عزیز میں اسلام کے نظام عدل کی ترویج وتقویم کی جدوجہد میں شامل رہا۔ دعوت وتبلیغ کا آغاز بھی اسی عرصہ میں ہوا، توحید وسنت، مسئلہ ختم نبوت، عظمت اصحابؓ واہل بیت رسولؐ اور اصلاح معاشرہ ووحدت امت میرے اہم فکری اہداف ہیں، جن کی اساس پر دعوت کا سفر جاری رہا۔

اب ایک فرقہ کے مطالبہ پر تعلیمی اداروں میں پرائمری سے میٹرک تک کے نصاب دینیات کو جداگانہ حیثیت دینے کے دعویٰ پر ملک کی واضح اکثریت کا جمہوری اور اصولی استحقاق مجروح کیا گیا اور مسلمانوں کے منصوص ومسلمہ عقائد کے مقابلہ میں ایسا مواد شامل نصاب کردیا گیا جس سے تفریق ومنافرت کے جراثیم پھیلیں اور منفی رجحانات کی تکمیل ہو۔ اس مرحلہ پر ہم نے حضرت مولانا مفتی محمود، حضرت شیخ سیّد محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا خان محمد کندیاں شریف والے، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان اور شیخ عبدالہادی دین پوری رحمۃ اللہ علیہم کی مشاورت وسرپرستی میں ''مجلس تحفظ حقوق اہل سنت وجماعت'' کی بنیاد رکھی، جس کے زیر اہتمام ملک کے مرکزی مقامات پر کانفرنسز کا انعقاد کرکے ملک کی نظریاتی سرحدات کے تحفظ کا فریضہ ادا کیا گیا۔ ۱۹۷۴ء لاہور میں عظیم الشان کنونشن ترتیب دیا، جس میں ۵۰۰ سے زیادہ علماء ومشائخ نے شرکت کرکے ''عالمی مجلس تحفظ حقوق اہل سنت'' کے مطالبات کی تائید فرمائی، جو مندرجہ ذیل تھے:

☆... جداگانہ نصاب دینیات ختم کرکے ملک کی واضح اکثریت کے عقائد ونظریات پر مبنی نصاب دوبارہ رائج کیا جائے۔

☆... اصحابؓ واہل بیت رسولؐ کے مقام وعظمت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے اور اسلام کے نمائندہ کرداروں کے خلاف زبان وقلم سے توہین کرنے والوں کے لیے عبرتناک سزا تجویز ہو۔

☆... ملک کا دستور قرآن وسنت کی بنیاد پر ترتیب دیا جائے، جس کی عملی تشریح وتوضیح کے لیے دورِ خلافت راشدہ کو حجت بنایا جائے۔

☆... خلفائے راشدینؓ کے ایام شہادت ووفات سرکاری سطح پر منائے جائیں۔

☆... قومی اور فوجی خدمات کے صلہ میں ''نشانِ حیدر'' کی طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ناموں پر اعزازات موسوم کرکے ان محسنین امت کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔

☆... محرم الحرام پوری ملت اسلامیہ کے لیے ماہ محترم ہے، اسے فرقہ وارانہ تشخص کے فروغ میں استعمال ہونے سے بچایا جائے۔

ان مطالبات کے حق میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا مفتی محمود، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا خواجہ خان محمد، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان، مولانا عبیداللہ انور نوراللہ مراقدہم اور دیگر علماء ومشائخ نے بھرپور تائید فرمائی۔ علاوہ ازیں کراچی سے کشمیر اور کوئٹہ سے درۂ خیبر تک ہزاروں کانفرنسز، پمفلٹس اور رسائل فرزندانِ اسلام کی فکری تعمیر کا تسلسل، ہماری جدوجہد کے روشن نقوش ہیں۔ کئی قومی اور ملی تحریکوں میں شرکت ہوتی رہی۔ بالخصوص تحریک تحفظ ختم نبوت، تحریک نظامِ مصطفیٰ اور مختلف ادوار کی آمریت کے خاتمہ کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ صدر ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور میں قید وبند کے مراحل سے گزرا، بالخصوص یحییٰ خان کے مارشل لاء میں ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں بیتے ہوئے لمحات یاد رہیں گے۔ جب جون، جولائی اور اگست کی گرمی میں ہم پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑیوں میں بند گویا موت وزیست کی کشمکش میں وقت گزارتے تھے۔ دینی محاذ پر اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے جو فتنے خطرہ بنے ہوئے ہیں ان میں سرفہرست منکرین ختم نبوت اور مرزا قادیانی کی روحانی ذریت ہے، جو اسلام کے لبادہ میں امت مسلمہ کی مرکزیت کو سبوتاژ کرنے پر کمربستہ ہیں، جنہیں مغربی استعمار کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ فرزندانِ اسلام کے دینی مستقبل کے لیے سب سے زیادہ مہلک قوت کے طور پر مصروف کار ہیں۔ اس فتنے کی سرکوبی میں حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کردار ادا کیا، اسے سرمایۂ نجات سمجھتا ہوں۔ ۷۴-۱۹۷۳ء میں مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی سینٹرل باڈی کا رُکن رہا، پورے ملک میں اس حوالہ سے ہونے والے جلسوں، کانفرنسز میں شرکت ہوتی رہی۔ پشاور سے کراچی اور کوئٹہ سے کشمیر تک ختم نبوت کانفرنسز میں شرکت کی۔ ۶ رستمبر ۱۹۷۴ء میں راولپنڈی کے اس اجلاس میں بھی شریک تھا، جس کے اگلے روز ذوالفقار علی بھٹو نے قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ

www.banuri.edu.pk

تسلیم اور اسمبلی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا اور امت مسلمہ کی تقریباً ایک صدی کی تاریخی کاوشیں بارآور ہوئیں۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۶ء عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے ہونے والی مساعی میں شامل رہا۔ امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ کی سربراہی میں قائم مجلس عمل کا مرکزی رکن رہا۔ چاروں صوبوں میں ہونے والے اجتماعات میں شرکت اور تحریک کو مؤثر ونتیجہ خیز بنانے میں شب وروز کوشاں رہا۔ ۱۶؍فروری ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد پہنچ کر اسمبلی ہال کے سامنے مطالبات کے حق میں مظاہرہ کی ترغیب دی۔ کوئٹہ، حیدرآباد، کراچی، پشاور، ملتان، لاہور، سکھر اور دیگر مرکزی مقامات پر ہونے والی کانفرنسز میں لوگوں سے وعدہ لیا کہ وہ اسلام آباد پہنچ کر عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے تجدید عہد اور راور ملی مرکزیت کا مظاہرہ کریں۔ لوگ انتہائی تکلیف دہ مشکلات کو عبور کرکے پہنچے، مگر بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے.... اس وقت کے بے بس وزیراعظم محمد خان جونیجو کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بازی ہاردی اور حکمران کی ساحری ہماری تمام جدوجہد کو ہڑپ کرگئی۔ سرکار کے جھوٹے وعدوں پر یقین کرکے مظاہرہ ملتوی ہوگیا۔‘‘

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت سے عارضۂ قلب اور شوگر کی تکلیف میں مبتلا چلے آرہے تھے۔ صبح اچانک طبیعت بگڑ گئی، آپ کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا، لیکن آپ کی روح قفس عنصری سے پہلے ہی عالم بالا کو جاچکی تھی۔ رات آٹھ بجے نماز جنازہ کا اعلان ہوا، آپ کی نماز جنازہ آپ کے صاحبزادہ نے پڑھائی، جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی سعادت حاصل کی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ حسنات و مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں، آپ کی جملہ سیئات کو مبدل بحسنات فرمائیں اور آپ کو جنت الخلد کا مکین بنائیں اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ قارئین سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔

....

یادگارِ اسلاف حضرت مولانا محمد عبداللہ (بھکر) کی رحلت

جمعیت علماء اسلام کے سرپرست، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوری نوراللہ مراقدہما کے مرید ومسترشد، حضرت سید نفیس شاہ الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز، خواجہ خواجگان حضرت خواجہ خان محمد قدس سرہٗ کے محبّ ومرید، جامعہ قادریہ بھکر کے بانی، رئیس وشیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ (بھکر) ۲۸؍صفر الخیر ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۱؍دسمبر ۲۰۱۵ء بروز جمعہ رات دس بجے اس دنیا کی ۸۰؍بہاریں دیکھ کر خالق حقیقی سے جاملے۔ **إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ماأعطٰی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔**

حضرت مولانا محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۵ء میں ڈھوک زماں گاؤں کے باشندے، اعوان برادری

کے چشم و چراغ حضرت مولانا یار محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور قرب وجوار کے مدارس ومساجد سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کے فاضل جناب حضرت مولانا محمد رمضان صاحب سے مسجد زرگراں میانوالی میں تعلیم حاصل کی، دورہ حدیث جامعہ سراج العلوم سرگودھا سے کیا۔

۱۹۶۰ء میں مدرسہ دارالہدیٰ کے ذمہ داران حضرات نے اپنے مدرسہ میں تدریس کی دعوت دی، جسے آپ نے بخوشی قبول کیا، اس کے ساتھ آپ نے مسجد-جس کا قدیمی نام طویلہ تھا اور بعد میں اس کا نام جامع مسجد فاروق رکھا گیا- میں امامت وخطابت کے فرائض بھی سرانجام دینا شروع کیے۔ ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کا الیکشن لڑا، بیعت کا پہلا تعلق حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ سے قائم کیا، اس کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ سے تجدید بیعت کی، ان کے بعد حضرت مولانا سید نفیس شاہ الحسینی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت خواجہ خان محمد قدس سرہٗ سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔ غالباً ۱۹۹۵ء میں اپنے شیخ اول کے نام سے مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام جامعہ قادریہ رکھا گیا۔ آپ موصوف اس کے شیخ الحدیث تھے۔ آپ کے حالات کے بارہ میں شاہین ختم نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب دامت برکاتہم رقم طراز ہیں:

''تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران مولانا محمد عبداللہ مسجد زرگراں مدرسہ تبلیغ الاسلام میں زیر تعلیم اور دفتر ختم نبوت کے انچارج ہوتے تھے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر صوفی ایاز احمد خان نیازی، نائب صدر مولانا محمد رمضان صاحب اور ناظم اعلیٰ مولانا محمد عبداللہ کو بنایا گیا۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس وقت میری عمر سولہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ آپ ان دنوں شرح وقایہ والے سال پڑھتے تھے۔ آپ دفتر کے بھی انچارج تھے۔ مرکز سے رابطہ اوران کے پروگرام کی روشنی میں میانوالی ضلع بھر میں تحریک کو آگے بڑھانا آپ کے دم قدم سے تھا۔ تحریک سے قبل وہاں ختم نبوت کانفرنس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالرحمٰن میانوی، مولانا محمد عبداللہ درخواستی، مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہم نے خطاب فرمایا تھا۔

مولانا محمد رمضان، صوفی ایاز خان نیازی، صوفی عبدالرحیم نیازی، صوفی شیر محمد زرگر، حضرت مولانا خواجہ خان محمد، مولانا پیر شاہ عالم، مولانا محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر حضرات نے میانوالی سے تحریک ختم نبوت کے اَلاؤ کو روشن رکھا۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ ۳/اپریل کو گرفتار ہوئے اور ۱۸/جولائی ۱۹۵۳ء کو رہا ہوئے۔ مولانا محمد عبداللہؒ جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء ثانی تک مجلس تحفظ ختم نبوت سے وابستہ رہے۔ اس سے پہلے مجلس احرار اسلام سے تعلق تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء کے بعد باقاعدہ مجلس تحفظ ختم نبوت سے استعفا دیا، جو صدر مجلس تحفظ ختم نبوت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے باضابطہ جمعیۃ علماء اسلام میں شمولیت اختیار کی۔ پہلے ضلع میانوالی - ان دنوں بھکر بھی میانوالی کی ایک تحصیل تھی - پھر سرگودھا ڈویژن، اس کے بعد بارہا پنجاب کے جمعیۃ علماء اسلام کے امیر منتخب ہوئے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب جمعیۃ علماء اسلام میں آپ کے استاذ مولانا محمد رمضان مرحوم ایک طرف تھے، لیکن آپ برابر حضرت مولانا مفتی

محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بعدۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ رہے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ کا مجلس ختم نبوت سے جمعیۃ علماء اسلام میں جانا، یہ جمعیۃ اور مجلس کے رہنماؤں کے باہمی تعاون کے فیصلوں پر عمل درآمد کا حصہ تھا۔ مولانا محمد عبداللہؒ تادم واپسیں جمعیۃ علماء اسلام کل پاکستان کے مرکزی سرپرست اعلیٰ تھے۔

آپ نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء، تحریک ختم نبوت ۱۹۸۴ء غرض تینوں تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ جب بھی ملتان تشریف لاتے آپ کا قیام ہمیشہ دفتر ختم نبوت میں ہوتا۔ ختم نبوت کانفرنسہائے چنیوٹ، پھر چناب نگر میں شرکت سے کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ مجلس کے ایک ایک کام پر نظر رکھتے تھے۔ تعاون، سرپرستی، رہنمائی اور اصلاح فرماتے تھے۔ ختم نبوت کے کام کے دل وجان سے معترف تھے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ بہت صاف ستھرا لکھنے کا ذوق رکھتے تھے، اپنا مافی الضمیر تحریر کے ذریعہ سمجھانے کے ماہر تھے۔ ذوق انتہائی نفیس تھا، گفتگو ہمیشہ اتنی پاکیزہ اور بے عیب ہوتی تھی کہ دشمن بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ فقیر نے ایک دفعہ ایک مجلس میں شیعہ حضرات کی کسی عبادت گاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے امام باڑہ کا لفظ استعمال کیا، فوراً ٹوک دیا، فرمایا: امام بارگاہ کہو، وہ حضرات اپنی عبادت گاہ کو امام بارگاہ کہتے ہیں، امام باڑہ کہنا ان کے نام کو بگاڑنا ہے، جو اخلاقاً درست نہیں، ان کے امام ہمارے بھی رہنما اور بزرگ تھے، ان کی نسبت سے قائم جگہ کو باڑہ کہنا کتنا توہین آمیز ہے! اختلاف اپنی جگہ، اخلاقی قدروں کو پائمال نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی میں ایک تو اس غلطی کا پہلی بار احساس ہوا، ورنہ مابدولت تو ہمیشہ یہی سوقیانہ نام استعمال کرتا تھا۔ دوسری یہ بات سمجھ آئی کہ زندگی بھر آپ نے پہلے ماہنامہ انوار مدینہ پھر ماہنامہ مناقب کے ذریعہ عظمت صحابہؓ واہل بیتؓ کی جنگ لڑی، لیکن طبیعت میں اعتدال کا یہ عالم تھا کہ علیحدگی میں بھی غیر مناسب و نازیبا الفاظ کا استعمال ان پر گراں گزرتا تھا۔ یہی وہ آپ کی خوبیاں تھیں جس نے آپ کو دوستوں وغیروں کی نظروں میں باوقار بنادیا تھا۔

مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ ریکارڈ رکھنے کے خوگر تھے، ایک ایک پرزہ سنبھال کر رکھتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری قومی تاریخ کا اپنے اندر بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ مولانا محمد عبداللہؒ کریم النفس، درویش منش، اجلی سیرت کے رہنما تھے، ان کا وجود خیر وبرکت کا خزانہ تھا، وہ انتہائی زیرک اور شریف انسان تھے، ان سے علم اور علماء کا وقار قائم تھا۔ آپ جب تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں گرفتار ہوئے تو آپ کا قد ۵ فٹ گیارہ انچ تھا، یہ آپ نے خود تحریر کیا ہے، یہ آغاز جوانی تھا۔ بعد میں کتنا اضافہ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ خوب دراز قد، خوب کتابی کھلا اور وجیہ گوراچٹا، چہرہ دل لبھانے والا تھا۔ کھلی پیشانی، عقابی نظریں، ستواں ناک، دل کی طرح سینہ بھی دراز، غرض وسیع القلب ووسیع الصدر تھے۔ سفید وجیہ چہرہ پر سفید داڑھی حسن کی بلندیوں کو چھوتی اور دلوں کو لبھاتی تھی۔

مولانا ہمیشہ سفید لباس استعمال کرتے تھے۔ شاید شلوار بھی استعمال کرتے ہوں، لیکن اکثر آپ چادر استعمال کرتے تھے، کندھے پر اکثر کلاچی کی لنگی ہوتی تھی۔ پگڑی ہمیشہ پشاوری استعمال کرتے تھے۔

چلنے میں علم کا وقار، متانت وسنجیدگی لیے ہوئے جس مجلس میں ہوتے اہل مجلس کی نگاہوں کا مرکز ہوتے تھے۔ بہت کم گو تھے، مگر جب بولتے تو موتی رولتے تھے۔ آپ کی ان خوبیوں نے آپ کو ہر دل عزیزی اور محبوبیت کے مقام پر فائز کرایا تھا۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ بھکر والوں نے اپنے مشائخ عظام کا جس طرح احترام کیا وہ آج کل کی نسل کو سمجھانا مشکل ہے۔ راقم کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ گھنٹوں مجلس میں بیٹھتے تو حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایسے مؤدب ہوکر بیٹھتے کہ گویا ''علٰی رأسہٖ طائر'' کا مصداق بن جاتے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ امسال علالت کے باعث چناب نگر ختم نبوت پر تشریف نہ لائے، لیکن اپنے صاحبزادہ حضرت مولانا صفی اللہ صاحب کو اپنی نمائندگی کے لیے روانہ فرمایا۔ مولانا محمد عبداللہؒ بہت ہی جفاکش، محنتی اور بھرپور جذبہ رکھنے والے مشنری اور نظریاتی عالم دین تھے، ان کی ذات سے بہت ہی خیر وبرکت کی یادیں وابستہ تھیں، ان کے وصال نے تاریخ کا ایک باب بند کردیا۔

گزشتہ کچھ دنوں سے کمر کے مہروں میں درد شروع ہوا۔ بہاول پور وکٹوریہ ہسپتال جانے کا فیصلہ ہوا۔ گھر سے اپنے قائم کردہ جامعہ قادریہ میں تشریف لائے، تمام طلبہ واساتذہ سے فرداً فرداً مصافحہ وملاقات کی۔ بہاول پور گئے، علاج شروع ہوا، مہروں کا قریباً پانچ گھنٹے آپریشن ہوا، جوانوں کی طرح دل کام کررہا تھا، آپریشن کرنے والے ڈاکٹر صاحبان بہت مطمئن تھے کہ آپریشن کامیاب رہا۔ آپ کے جسم میں بھی خوب حرکت آگئی، سب مطمئن تھے، لیکن تقدیر تو بہرحال تقدیر ہے۔ آپریشن کے بعد غذا میں کمی ہوگئی، کوئی چیز کھانے پینے کو طبیعت نہ کرتی تھی، اس سے نہ صرف کمزور ہوئے بلکہ بلڈ پریشر کم ہوا، وزن کم ہوا، جسم میں قوتِ مدافعت کی کمی ہوئی، ایسی کمی ہوئی کہ دنیا میں آنکھ بند کی اور جنت میں جا کھولی۔ بہاول پور سے پھر ایمبولینس کے ذریعہ سفر شروع ہوا، جسد خاکی پھر جامعہ قادریہ بھکر صبح ساڑھے تین بجے لایا گیا، جب گئے تھے تو ملاقاتیوں کے دل دھڑکتے تھے، اب واپس تشریف لائے تو ملاقاتیوں کی آنکھیں چھلکتی تھیں۔ آپ کی وفات کی خبر ملک بھر میں پھیلی، جس نے خبر سنی دم بخود ہوگیا، اگلے دن بھکر کے سب سے بڑے اسٹیڈیم میں جنازہ ہوا جو ملک کے بڑے جنازوں میں سے ایک تھا۔ جب کہ بھکر شہر کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ عام قبرستان میں ابدی نیند سو گئے، ''اب اس دن اٹھیں گے جب کہ پوری انسانیت اٹھے گی۔'' آپ کی نماز جنازہ خواجہ خلیل احمد مدظلہ سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف نے پڑھائی۔

آپ نے اپنی یادگار دو بیٹے حافظ کفایت اللہ صاحب اور مولانا محمد صفی اللہ صاحب مدظلہما چھوڑے ہیں۔ ادارہ بینات حضرت کے متعلقین سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور حضرت کی موت کو امت مسلمہ کا عظیم نقصان قرار دیتا ہے۔ قارئین بینات سے حضرت کے لیے ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ کو جنت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلٰی آلہ وصحبہ أجمعین

www.banuri.edu.pk

www.banuri.edu.pk

www.banuri.edu.pk

محض تصاویر دیکھ کر مشین کا حتمی کاروبار کرنا!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس بارے میں کہ:

۱:- ہمارا کاروبار مشینری کا ہے، ہم باہر سے مشینری منگوا کر یہاں فروخت کرتے ہیں، مشینری کی تصاویر کو کمپیوٹر پر دیکھ کر پھر سودا طے کرتے ہیں، جس شخص کے ساتھ کسی چیز کا سودا کرنا ہوتا ہے، اس کی مشین کی تصویر بذریعہ انٹرنیٹ دیکھنے کے بعد قیمت متعین کی جاتی ہے، آرڈر پہلے دیتے ہیں، چیز بعد میں آتی ہے، قیمت پہلے ادا کردی جاتی ہے، خیارِ رؤیت کو وہ بائع نہ جانتا ہے اور نہ مانتا ہے، پاکستان آکر وہ چیز چاہے اسی معیار کی ہو جو انٹرنیٹ پر دکھائی گئی تھی یا نہ ہو، بہرصورت یہ چیز خریدنے والے کی ہوگئی، نہ واپس کی جاسکتی ہے اور نہ قیمت میں کٹوتی کی جاسکتی ہے۔ کیا اس طرح کا عقد جائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو جواز کی کیا صورت ہوگی؟

۲:- بسا اوقات بائع ایسی صورت میں جب مشین معیاری نہ ہو، تو قیمت کے گھٹانے پر راضی ہوجاتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ جبکہ خریدی ہوئی چیز یا مشین کسی بھی صورت واپس نہیں ہوسکتی۔

۳:- بسا اوقات مشین کی بیع طے ہوجاتی ہے، ادائیگی نہیں ہوتی یا آدھی ادائیگی ہوتی ہے، لیکن بائع کمپنی کی طرف سے یہ مشین خریدنے والے کی ہوگئی، بھلے رقم بعد میں ادا کریں۔ کیا اس صورت میں یہ مشین مشتری کسی اور کو فروخت کرسکتا ہے؟ جبکہ ابھی تک مشتری نے مشین کی کل قیمت بائع (کمپنی) کو ادا نہیں کی اور تجارتی اصول کے مطابق مشتری اس مشین کا بہرحال مالک ہے اور واپسی ناممکن ہے۔

۴:- بسا اوقات کوئی کمپنی مشتری کو تصویر دکھا کر خیار رؤیت دیتی ہے، اس طرح کہ اگر پسند نہ ہو تو قیمت میں کٹوتی پر کمپنی راضی ہے، واپسی پر نہیں، یعنی اقالہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں چونکہ چیز باہر ملک سے پاکستان آچکی ہے، جس پر کافی خرچ آچکا ہوتا ہے، لہٰذا مشین ناقابل واپسی ہوتی ہے، البتہ قیمت کے اعتبار سے کمی کی جاسکتی ہے، لیکن کبھی بعض کمپنیاں ایسی ہوتی ہیں جو خیار رؤیت نہیں دیتیں اور قیمت میں بھی باوجود عیب وغیرہ کے کوئی کمی نہیں کرتیں، کیا اس طرح عقد جائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

مستفتی: حاجی نثار، کراچی

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

۱، ۲:- واضح رہے کہ انٹرنیٹ پر تصاویر دیکھ کر مشین کا معیار اور سودا طے کرکے اس شرط پر

مشینری منگوانا کہ خریدار کو دیکھنے کے بعد غیر معیاری ہونے کی صورت میں کسی قسم کے اعتراض کا حق نہیں ہوگا، شرعاً ناجائز ہے، نیز منگوائی گئی چیز یا مشین کے ناپسند ہونے کی صورت میں قیمت میں کمی کردی جائے یہ بھی ناجائز ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ فروخت کرنے والی پارٹی کو معیاری چیز بھیجنے کا پابند بنایا جائے، مطلوبہ معیار سے کم ہونے یا تعارف میں ذکر کردہ تفصیل کے خلاف ہونے کی صورت میں معاملہ کرنے کی پابندی کا استثناء کرلیا جائے یا پھر جیسے بھی ہو خریدار پارٹی بیع فاسد ہونے کے باوجود اسے لے لے اور آگے مناسب دام میں بیچ دے، بیع فاسد ہونے کے باوجود ناقابل واپسی املاک پر خریدار کا قبضہ وحق فقہاء کی تصریحات کے مطابق اگلے تصرفات کے لیے تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ ''فتح القدیر'' میں ہے:

''ثم جملة المذاهب فيه أن يقال: كل شرط يقتضيه العقد كشرط الملك للمشترى لايفسد العقد لثبوته بدون الشرط وكل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه هو من أهل الاستحقاق يفسدهٗ۔'' (ج:۶،ص:۷۷، ط: بیروت)

''فتاویٰ شامی'' میں ہے:

''وإذا قبض المشترى المبيع برضا بائعه صريحا أو دلالة فى البيع الفاسد ولم ينهه ملكه ...... (و) يجيب (على كل واحد بيدها فسخه قبل القبض أو بعده مادام المشترى فى يد المشترى الخ۔'' (فتاویٰ شامی، ج:۵،ص:۹۱، ط: سعید)

''فتاویٰ عالمگیری (ص:۳،ص:۱۴۷، ط: رشیدیہ)'' میں ہے:

''وإذا أذن له بالقبض فى المجلس أو بعد الافتراق عن المسجد صح قبضه ويثبت الملك قياسا واستحساناً إلا أن هنا الملك يستحق النقص الخ''۔

۳:- اپنے قبضہ وتحویل میں آنے کا انتظار کریں، جب مشین خریدار کے شرعی وقانونی قبضہ وتحویل میں آجائے تو قیمت کی ادائیگی سے قبل بھی بیچ سکتے ہیں، جب تک خریدی جانے والی چیز خریدار کے قبضہ میں نہ آئے تو بیع نہ کی جائے، البتہ وعدۂ بیع کرسکتے ہیں، جس کا پورا کرنا اخلاقاً ضروری ہوگا اور اس وعدہ کے پورا کرنے کے لیے بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو پابند سمجھا جائے۔ فتح القدیر (ج:۶،ص:۱۳۵، ط: بیروت) میں ہے:

''فصل ومن اشترى شيئاً مما ينقل ويحول لم يجز لهٗ بيعهٗ حتى يقبضهٗ لأنهٗ عليه الصلاة والسلام نهٰى عن بيع مالم يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد علٰى اعتبار الهلاك''۔

۴:- منگوائی گئی مشین کے غیر معیاری اور ناقص ہونے کی صورت میں خیارِ رؤیت کی بنیاد پر مشین کی خریداری کا سابقہ معاملہ ختم کردیں اور ازسرنو دونوں فریق آزادانہ حیثیت میں نئے بھاؤ تاؤ کے ذریعہ نیا معاملہ کرلیں، تو یہ جائز ہوگا۔

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد عبدالمجید دین پوری	محمد انعام الحق	محمد عمر

متعلم تخصص فقہ اسلامی، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری، ٹاؤن کراچی

نقد و نظر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ادارہ

مکاتیب الکریم

مولانا عبد القیوم حقانی، صفحات: ۳۱۱۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہؓ، خالق آباد، نوشہرہ۔

زیرتبصرہ کتاب فاضل دیوبند، شیخ التفسیر حضرت مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی نور اللہ مرقدہٗ کے ان علمی، ادبی، تاریخی اور اصلاحی مکتوبات کا مجموعہ ہے جو حضرت مولانا عبد القیوم حقانی دامت فیوضہم کے نام لکھے گئے۔ ان مکتوبات میں بہت سے قیمتی علوم ومعارف، اکابرین دیوبند کا تذکرہ، مشاہدات وتجربات کے نچوڑ کے علاوہ بہت ساری قدیم وجدید کتابوں کا تعارف، فقہ اور فتاویٰ کی عمدہ مثالیں اور باطل فرقوں کا تعاقب کس طرح کیا جائے، یہ سب کچھ اس مجموعہ کے پڑھنے سے قاری کو آسانی حاصل ہوجاتا ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے۔

قادیانیوں کا کفر کے اندھیروں سے اسلام کی روشنیوں تک

مولانا مفتی عظمت اللہ سعدی، صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامیہ جامعہ عظمت المدارس العربیہ جدید ہنجل، بنوں، خیبر پختون خوا۔

مفتی عظمت اللہ سعدی صاحب نے قادیانیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے والوں کی داستان غم واندوہ، حیرت انگیز انکشافات، قبولیت اسلام کی وجہ، اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ انہیں کی زبانی مختلف کتابوں سے اخذ کرکے اس کتاب میں جمع کردیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک مسلمان کو اپنے ایمان میں جلا اور دولت اسلام کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ باطل فتنوں کے خلاف کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب عمدہ راہنما ہے۔

خوشبوئے رسول (ﷺ)

مولانا محمد احسان اللہ فاروقی، صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الحبیب، وڈالہ

www.banuri.edu.pk

سندھواں، پسروررو ڈ، تحصیل ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ۔

حضرت مولانا محمد احسان اللہ فاروقی کو اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے عشق نبی میں ڈوب کر ایسی کتاب مرتب کی ہے جو سراپا خوشبو ہی خوشبو ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی ایسی کتاب نظر سے نہیں گزری۔

قاری جب اس کتاب کو پڑھنا شروع کرتا ہے تو وہ تصور میں اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجود پاتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مؤلف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو کی عجیب قسمیں کتاب میں درج کی ہیں، جو سب کی سب مستند حوالوں سے ثابت شدہ ہیں، اور کتاب میں زبان وبیان میں نظافت، سلاست اور ادبی چاشنی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں ایسے ناصحانہ واقعات بھی درج ہیں جو قلوب میں اثر پذیری کے اعتبار سے بہت مؤثر ہیں، کتاب میں دورنگا قیمتی کاغذ، حسین ٹائٹل اور عمدہ طباعت سے مزین ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مؤلف کی اس عمدہ محنت وکوشش کو قبول فرمائیں اور اس کتاب کے ذریعہ جملہ طبقات وافراد کو خوشبوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معطر فرمائیں۔

یادگارِ اکابر (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ)

محمد نعمان ارشدی، صفحات: ۹۰۴۔ عام قیمت: ۹۰۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ رشیدیہ بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔

حضرت مولانا قاری تنویر احمد شریفی حفظہٗ اللہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنی تالیفات کے ذریعہ اصاغر کو اکابر کے ساتھ جوڑنے کی عمدہ کوشش فرمارہے ہیں۔ ہمارے وہ اکابر جن کا شاید کئی اصاغر کو نام تک بھی معلوم نہیں ہوگا، مولانا موصوف ان اکابر کی تحریرات کو کتب خانوں اور لائبریریوں سے چن چن کران کا خوبصورت گلدستہ سجا کر ہر سال قارئین کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے، جس میں قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ کی سوانح، دارالعلوم دیوبند کی بنیاد، گمراہ کن عقائد ونظریات کا رد، باطل فرقوں کا تعاقب اور اس وقت کی ایک تاریخ اس اہم دستاویز میں سمودی گئی ہے۔ اس خاص نمبر میں چھیالیس مقالات ہیں، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں: حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا ذوالفقار دیوبندیؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت سید انور شاہ کشمیریؒ، سائیں توکل شاہ انبالویؒ، مولانا سید اخلاق حسین قاسمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ جیسے حضرات کے نام نامی نمایاں ہیں۔

اس کے شروع میں دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم کا مبارک بادی کا خط اور مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی مد فیوضہٗ کی تقریظ ثبت ہے۔ کتاب کی طباعت، کاغذ، جلد اور ٹائٹل خوبصورت اور عمدہ ہے۔ امید ہے باذوق قارئین ضرور اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے۔